مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد

۳۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۴۔ ضیاء الدین اصلاحی

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ۔ حافظ محمد یحیٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۶ عدد ۴۔ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ۔ ماہ اکتوبر ۱۹۹۵ء

فہرست مضامین

شذرات

گذشتہ مہینہ ان صفحات میں اردو کے متعلق اردو والوں کی غفلت و کوتاہی کا رویہ زیر بحث آیا تھا، ممکن ہے تحریر کا لب و لہجہ تلخ رہا ہو لیکن بات فی نفسہ غلط نہیں تھی، کیا یہ درست نہیں ہے کہ اردو تحریک کے قائدین، اردو کے سرکاری و نیم سرکاری اداروں سے وابستہ اشخاص اور اردو کے اساتذہ کی شہرت و ناموری، عزت و افتخار بلکہ امارت و وجاہت اردو ہی کی رہین منت ہے، اس کے باوجود اگر وہ اس کو محض اپنے اغراض و مفاد ہی کا وسیلہ بنائیں اور اس کی ترویج و اشاعت کے بنیادی اور ضروری کام سے سروکار نہ رکھیں تو کیا اسے اردو کا استحصال کہنا بیجا اور نامناسب ہوگا، رہی تلخ نوائی تو یہ دردِ دل سوا ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔

پورے ہندوستان اور خصوصاً اتر پردیش میں اردو کا اصل مسئلہ اس کو رواج اور فروغ دینے کا ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب لوور اور اپر پرائمری اسکولوں سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں تک اردو پڑھنے پڑھانے کا مناسب بندوبست ہو، گھروں، دکانوں، بازاروں، دفتروں، کچہریوں غرض نجی، پبلک اور قومی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا عمل دخل ہو۔ اگر کہیں حالات نامساعد ہوں، تو کم از کم خود اردو والے اپنے تئیں اس کا چراغ گل نہ ہونے دیں اور یہ ان کے گھروں میں نقش و نگارِ طاقِ نسیاں نہ ہو جائے۔ اندیشہ ہائے دور دراز میں پڑ کر نہ اردو کو ملنے والی رعایتوں سے فائدہ اٹھانے سے باز رہیں اور نہ مزید اس کے جائز اور جمہوری حقوق کی بازیافت کے لئے آئینی جد و جہد ترک کریں ؏ حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی

مدت سے اردو یونیورسٹی کی آواز فضا میں گونج رہی ہے۔ تقریباً سال بھر پہلے اردو کے مشہور شاعر اور اہل قلم اور انجمن ترقی اردو ہند کے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے خوش خبری سنائی تھی کہ "آپ جلد ہی اخباروں میں اردو یونیورسٹی کے وجود میں آجانے کی خبر پڑھیں گے"۔ اب لوک سبھا انتخاب کا وقت آگیا ہے، بہت ممکن ہے کہ اس کے صدقے میں حکومت کے "مراحم خسروانہ" کا اعلان کر دیا جائے اور اردو والے جوش مسرت سے یہ کہہ اٹھیں کہ ؏

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

چاہے بعد میں اس کا حشر جو بھی ہو، حال ہی میں مدھیہ پردیش میں اردو اکادمی کی عمارت بن کر تیار ہوئی تو اس کا نام "ایوان ملا رموزی" کے بجائے "ملا رموزی سنسکرتی بھون" کر دیا گیا، اس "ستم کرم" کے اندیشے اور بار بار فریب کھانے کے باوجود اردو والے اردو یونیورسٹی کا اعلان سننے کے لئے بے تاب ہیں، اردو کا خاص علاقہ اتر پردیش رہا ہے اس لئے ہمیں اردو کے "کرم فرماؤں" نے اس کی گردن پر سب سے زیادہ "مشقِ ناز" کیا ہے، اس کا اقتضا تو یہی تھا کہ اسی ریاست کے کسی علاقہ میں اردو یونیورسٹی قائم ہوتی تاکہ کچھ تلافی ہوتی لیکن ہم کو اس پر اصرار نہیں ہے، حیدر آباد اور بہار کا حق بھی کم نہیں ہے اس لئے اس مسئلہ کو متنازعہ نہیں بنانا چاہیے اور جہاں بھی یونیورسٹی قائم ہو اس کا خیر مقدم ہر ایک کو کرنا چاہیے، اردو کو ملنے والی رعایتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ازبس ضروری یہ ہے کہ اردو والے اپنی قوت و توانائی نزاع و اختلاف میں نہ ضائع کریں۔

اردو والوں کو اصلی خوشی اسی وقت ہوگی جب اردو یونیورسٹی قائم ہو کر ان کی توقع کے مطابق اپنا اصل کام شروع کر دے اور اس سے اردو کا واقعی فروغ و استحکام ہو، یونیورسٹی قائم ہونا بڑی اچھی اور خوش آیند بات ہے مگر اردو کا اصلی اور بنیادی مسئلہ اسی وقت حل ہوگا جب اس کی تعلیم اور خاص طور پر بنیادی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہو، اردو آبادی ملک میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، اور اردو گھرانوں کے بچوں اور بچیوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم سے محروم نہیں رہنا چاہیے، جہاں جہاں اردو ٹیچر مقرر کئے جائیں وہاں وہاں اردو پڑھنے والے بچے ضرور موجود رہیں۔ تاکہ اردو ٹیچر اردو ہی پڑھانے کا کام کریں اور ان کو اس کے علاوہ دوسرے کاموں میں نہ لگایا جائے، اسی طرح دفتروں میں بھی اردو مترجمین اردو کا کام کریں، یہ ذمہ داری اردو والوں کی ہے کہ وہ ان باتوں کی نگرانی کرتے رہیں اور اس سلسلے میں ہونے والی زیادتیوں اور کوتاہیوں کا سدِ باب کریں تاکہ اردو ٹیچر اور اردو مترجمین عضو معطل بن کر نہ رہیں، ایسے موقع پر اردو تحریک کے قائدین اور سربر آوردہ لوگوں کا رویہ ضرور زیر بحث آئے گا کہ وہ جن باتوں کی تلقین دوسروں کو کرتے ہیں ان پر خود کہاں تک عمل پیرا ہیں۔ یہ بات کسی حال میں ذہن سے محو نہیں ہونی چاہیے کہ ابتدائی مرحلے میں اردو تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہوگا تو اردو یونیورسٹی میں طلبہ، اساتذہ اور کارکن کہاں سے آئیں گے، یا دوسرے دائروں میں اردو کے خدمت گذار کیسے فراہم ہوں گے۔

یہ گفتگو ختم کرنے سے پہلے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہونے والی اردو تعلیم و تدریس کے فروتر اور غیر اطمینان بخش معیار کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے گو اردو کے عام اداروں اور اس کی خدمت کرنے والی سوسائٹیوں کا معیار بھی پست ہوا ہے لیکن اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اردو کے تحقیقی اور تصنیفی کاموں کے قدر شناس اب بہت کم ہوتے جارہے ہیں، دوسرے ان کے مالی وسائل و ذرائع بہت محدود ہوگئے ہیں اور وہ اپنے امتیاز و تشخص کو قربان کر کے قومی اور سرکاری فیاضیوں سے متمتع ہونا پسند نہیں کرتے، ان کے مقابلے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے وسائل و ذرائع زیادہ ہوگئے ہیں، یہ کہنا بجا ہے کہ دوسرے مضامین کا معیار تعلیم بھی پست ہوا ہے لیکن اردو تعلیم و تدریس کا معیار زیادہ گرا ہے، اگر اس کے اسباب و وجوہ کی بحث و کرید کی جائے تو بات پھر تلخ نوائی تک جا پہنچے گی، اس موقع پر ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اردو کے گرتے ہوئے تعلیمی معیار کے ذمہ دار طلبہ و اساتذہ دونوں ہیں اس لئے ان کو مل جل کر اس کا تدارک کرنا چاہیے، اردو سے ان کی واقعی دلچسپی، ہمدردی اور شغف کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اردو کے معاملہ میں غفلت، کوتاہی، تن آسانی اور سہولت پسندی سے باز آجائیں اور یہ سمجھیں کہ وہ عرصۂ محشر میں ہیں اس لئے جو عمل ان کے دفتر میں ہو اسے اردو کے لئے حاضر کردیں اور اس کے تحفظ کے لئے اپنے ترکش کا کوئی تیر خطا نہ ہونے دیں۔

اس سال دارالمصنفین کے جلسہ انتظامیہ کی قرارداد کے مطابق بیرون ملک کے ممتاز علماء کو دارالمصنفین کا مراسلاتی ممبر بننے کی دعوت دی گئی تھی، سب سے پہلے شیخ محمد ناصر العبودی نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے اپنی حسب ذیل سات کتابیں کتب خانہ، دارالمصنفین کو نذر کی ہیں جن کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں، (۱) بلادالداغستان (۲) مع المسلمین البولندیین (۳) نظرۃ فی وسط افریقیۃ (۴) بورما (۵) جمھوریۃ آذربیجان (۶) جولۃ فی جزائر البحر الزنجی (۷) زیارۃ السلطنۃ برونائی الاسلامیہ۔ عبودی صاحب کی پیدائش عرب کی ریاست قصیم کے پایہ تخت بریدہ میں ہوئی اور وہ مختلف علمی و تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے، اس وقت وہ رابطۂ عالم اسلامی کے معاون جنرل سکریٹری ہیں۔

"سوانحی ادب و تذکرہ نویسی" کے موضوع پر رابطہ ادب اسلامی کا مذاکرہ دارالمصنفین میں ۱۰۔ ۱۲ نومبر ۹۵ء کو ہونے جارہا ہے، جس کی روداد انشاءاللہ آئندہ شائع ہوگی۔

مقالات

مولانا شبلیؒ کی ایک عدیم المثال و رفیع الشان تصنیف سیرۃ النبیؐ

از
محمد عارف عمری۔ رفیق دارالمصنفین

٭ یہ مضمون علامہ شبلی پر اکتوبر ۱۹۹۲ء میں ہونے والے ممبئی یونیورسٹی کے سمینار میں پڑھا گیا تھا، اس سال اپریل میں انجمن ترقی اردو ہند نے بھی علامہ پر ایک باوقار سمینار کیا تھا، میری خواہش تھی کہ وہاں بھی یہ پڑھا جاتا، لیکن مقالہ نگار اس میں اپنی مصروفیتوں کی بنا پر نہیں جاسکے، اب انہوں نے اس میں کسی قدر اضافہ کر کے معارف میں اشاعت کے لیے دیا ہے تو مقطع میں کچھ سخن گسترانہ باتیں بھی آگئی ہیں جو اگرچہ بہت معقول و مدلل ہیں، لیکن دراصل الٹے سیدھے اور بے ٹوٹے اعتراضات کرنے والے قابل اعتنا نہیں ہیں اور نہ مضمون نگار کا مقصد اس طرح کے اعتراضات کرنے والوں کا جواب دینا ہے تاہم انہوں نے دو چار مثالیں دے کر ایسے لوگوں کی تحقیق کا معیار ضرور دکھا دیا ہے کہ

ع نہ محقق بود نہ دانشمند

معترضین اور ان کے سرپرستوں کو علامہ شبلی کے منھ لگنے کے بجائے خواجہ شیراز کی اس حقیقت بیانی پر غور کرنا چاہیے کہ

شرح مجموعہ گل مرغ سحر می داند بس   کہ نہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست"

"ض"

مسلمانوں کو اپنے ہادی و رہبر پیغمبر آخرالزماںؐ سے جو عقیدت و محبت اور والہانہ تعلق ہے

اس کی بنا پر ہر دور میں سیرت رسولؐ انکا محبوب اور پسندیدہ موضوع رہا ہے اور مسلمانوں ہی پر موقوف نہیں ہے دوسری قوموں کو بھی آپؐ کی عظمت و جلالت کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا اور ان کے دانشوروں اور مصنفوں نے بھی سیرت نگاری کو اپنا موضوع بنایا، مشہور مستشرق مارگو لیوتھ لکھتا ہے:

"محمدؐ کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے، لیکن اس میں جگہ پانا قابل فخر چیز ہے"[1]

اس کے باوجود اس اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں کہ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف "سیرۃ النبیؐ"، متعدد انفرادی خصوصیات کی بناء پر سیرت کے پورے ذخیرۂ کتب میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے، ذیل میں اس کتاب کے بعض ایسے خصائص ومزایا کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو مولانا شبلیؒ کی اولیات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ علم کلام کی حیثیت سے سیرت کی تالیف یورپ میں علوم جدیدہ کے فروغ کے بعد فن تاریخ اور سیرت نگاری میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں، مستشرقین کی جماعت نے انہی علوم کی روشنی میں تاریخ اسلامی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر بے بنیاد الزامات کی ایسی یلغار شروع کردی کہ محسوس ہونے لگا کہ مسلمان علماء اور دانشور اس سیل رواں کے آگے مجبور اور بے بس ہو گئے ہیں، ایسی نازک گھڑی میں بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

"ایسے ہوشمند حریفوں کے مقابلہ کے لیے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے، جنھوں نے ان ہی کے طریقہ سے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی ہواؤں نے دنیا کے

---

[1] دیباچہ "محمدؐ" بحوالہ سیرۃ النبیؐ، مقدمہ ص ۹۲۔

علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا"[1]

سیرۃ النبیؐ کی سب سے بنیادی خصوصیت یہی ہے کہ یہ رسول اللہؐ کی محض ایک سادہ سوانح عمری نہیں ہے بلکہ اس میں آپؐ کی سیرت طیبہ کی تفصیل بیان کر کے دراصل اسلام کی تعلیمات و حقائق کو علم کلام کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، مولانا شبلی فن سیرت و سوانح کو خالص شخصی واقعات و حالات کا مجموعہ نہیں گردانتے بلکہ وہ اس فن کو شخصیت کے جلوے میں رونما ہونے والے واقعات کی مفصل کیفیت اور ان کے اسباب و نتائج کو نمایاں کرنے والا ایک جامع فلسفہ قرار دیتے ہیں اور یہی خصوصیت ان کے اور دوسرے سیرت نگاروں کے درمیان حد فاصل کا درجہ رکھتی ہے، مولانا شبلی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علوم و فنون کی صف میں سیرت (بائیوگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے، حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لیے دلیل راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہش رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، ستاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی و عمل، جد و جہد، ہمت و غیرت کی عجیب و غریب نیرنگیاں سکندر اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے، اس بنا پر سیرت و سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو شخص کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے کہ حالات و واقعات جو پائے جاتے ہیں وہ کس استقصاء و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں تاکہ مراحل زندگی کی تمام راہیں اور ان کے

---

[1] مقدمہ حیات شبلی: ص ۲۵۔

پیچ و خم ایک ایک کرکے نظر کے سامنے آجائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فردکامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہوجائیں تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہوسکتی ہے۔[1]

چونکہ سیرۃ النبیؐ سے پہلے کی عام تصنیفاتِ سیرت واقعہ نگاری پر مشتمل ہوتی تھیں اور پہلی مرتبہ مولانا شبلی نے اس طرز کہن کو ترک کرکے خالص علمی انداز میں سیرت کی تالیف کی اس لیے وہ اس کا سبب بھی بیان کرتے ہیں، لکھتے ہیں :

"اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی۔ علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے۔"[2]

حاصل یہ کہ سیرۃ النبیؐ کی حیثیت مولانا شبلی کی نظر میں محض ایک کتاب کی نہ تھی بلکہ سیرۃ نبویؐ کے معترضین اور نکتہ چینیوں کے جواب کے لیے یہ وقت کے علم کلام کی ایک ضرورت تھی اور اس کے ذریعہ کلمۂ اسلام کے دوسرے جزء محمد رسول اللہؐ کی مکمل تفسیر و تشریح مقصود تھی۔

اسی ضمن میں مولانا نے یورپ کے سیرت نگاروں کی تحریروں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ بھی لیا ہے، جنھوں نے علم و تحقیق اور معروضیت کے نام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کو متہم و مجروح کرنے کی مہم چلا رکھی تھی اور جن کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں سے مسلمانوں کا بھی ایک بڑا طبقہ متاثر اور مرعوب ہورہا تھا، مولانا لکھتے ہیں :

۱؎ سیرۃ النبیؐ، مقدمہ ص ۵، ۶ ۲؎ ایضاً ص ۔

"یورپ کے مورخین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ نعوذ باللہ ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آجکل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کردیا ہے، اس لیے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور سوانح دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انھی یورپ کی تصانیف کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہرآلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہانتک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کردی تو اس کا فرض ادا ہوگیا، اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔"[1]

غرض یہی وجوہ تھے جن کی بنا پر اس دور میں سیرۃ النبیؐ جیسی ایک علمی کتاب کی شدید ضرورت تھی، مولانا شبلیؒ کے الفاظ میں "یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں بلکہ ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعۂ ضروریات دینی و دنیوی ہے۔"[2]

۲- کتب و روایات سیرت کی تنقیح

سیرۃ النبیؐ کی دوسری اور نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں فن سیرت کی بنیادی کتابوں اور ان کی روایتوں کی تنقیح اور راویوں کی جرح و تعدیل کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، محدثین کی اصطلاح میں سیرت و مغازی کا علم حدیث سے الگ تصور کیا جاتا تھا، اس لیے عام طور پر اس کی روایتوں میں علم حدیث کی کتابوں کی طرح شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی، جس کی بنا پر اس فن میں

۱؎ سیرۃ النبیؐ: مقدمہ ص ، ۲؎ ایضاً ص ۶۔

ہر طرح کی روایتیں شامل ہوگئیں، مولانا شبلیؒ نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

"سیرت کی کتابوں کی کم پایگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت صرف احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کردی گئی یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل سے متعلق ہیں ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں حاجت نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شایع ہوگئیں اور بڑے بڑے علماء نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کو درج کرنا جائز سمجھا[1]"

یہی بنیادی سبب ہے کہ سیرت کے ذخیرۂ کتب میں کوئی ایسا مستند مجموعہ نہیں پایا جاتا ہے جیسا کہ حدیث کے متعدد مجموعے مرتب کیے گئے ہیں، مولانا شبلی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصانیف میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا ہے، آج بیسیوں کتابیں قدماء سے کر متاخرین تک موجود ہیں مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سیدالناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ کسی میں یہ التزام نہیں ہے[2]"

واقعہ یہ ہے کہ کتب سیرت کی ان ہی غیر مستند اور ناقابل اعتبار روایتوں کا سہارا لیکر مغربی مصنفین نے سیرت طیبہ پر گھناونے اور رکیک حملے کیے ہیں، بقول مولانا شبلیؒ:

"یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معیار اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کا کل سرمایہ یہی روایتیں ہیں[3]"

---

[1] سیرۃ النبیؐ: مقدمہ ص ۴۹، ۵۰، [2] ایضاً حاشیہ ص ۱۱، [3] ایضاً جلد اول ص ۵۵۹۔

ان روایتوں کی تحقیق و تفتیش کے لیے مولانا شبلی نے سیرۃ النبیؐ میں کتب و سیرت کی روایتوں اور ان کے راویوں کے بارہ میں فن حدیث کے طرز پر تنقید و تحقیق کا معیار قائم کیا، جس کے لیے انھوں نے سیرت ابن ہشام، ابن سعد اور تاریخ طبری کے راویوں کے سینکڑوں ناموں کا انتخاب کرکے اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس روایت کی تحقیق مقصود ہو بہ آسانی کی جاسکے اور روایات سیرت کے اخذ و قبول کیلئے مندرجہ ذیل اصول متعین کیے:

۱۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

۲۔ سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے[1]

۳۔ سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں، مثلاً سیف، سری، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایہ ہیں، اس لیے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہے لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے انکے لیے یہ سرمایہ بیکار ہے[2]

۴۔ قرآن مجید اور کتب احادیث سے استناد | سیرۃ النبیؐ سے پہلے سیرت کی عام کتابوں میں قرآن مجید یا کتب احادیث کو حالات و واقعات کا ماخذ قرار دینے کا التزام نہ تھا، غالباً پروفیسر مارگیولیتھ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "محمدؐ" میں مسند امام احمد کو مرجع بنایا[3]، مگر مولانا شبلیؒ نے قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کو سیرت کا بنیادی اور اولین ماخذ قرار دیا۔ چونکہ ابتدا سے ارباب سیر اور محدثین دو متقابل گروہ سمجھے گئے ہیں اس لیے ایسے واقعات میں جہاں دونوں کے بیانات مختلف ہوتے ہیں سیرت نگاروں نے احادیث کی صحیح اور مستند روایتوں کو محض اس بنا پر نظرانداز کردیا ہے کہ یہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہیں، مولانا شبلی نے اس غیر مناسب طریقہ کار کو ترک

---

[1] سیرۃ النبیؐ: مقدمہ ص ۴۳، ۸، [2] ایضاً ص ۷، ۹۔

کرکے یہ متوازن اصول مقرر کیا کہ:

"جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں"[1]

اس سلسلہ میں عہد صحابہؓ سے لیکر کبار محدثین تک کے اقوال کی روشنی میں مولانا نے سیرت نگاری کا یہ ضابطہ مقرر کیا کہ:

"سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام حدیث میں کرنی چاہیے اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے"[2]

اس میں شبہ نہیں کہ کتب احادیث سے واقعات کی تلاش و تحقیق ایک طویل اور وقت طلب کام ہے اور باوجودیکہ مولانا شبلیؒ کے زمانہ میں علم حدیث کی بہت سی اہم کتابیں زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھیں، مگر مولانا نے واقعات کا ایک بڑا ذخیرہ اس سے فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کی، اس سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں:

"ارباب سیر سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں ان موقعوں پر ڈھونڈتے ہیں جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہیے اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں، اس لیے اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کیے جو اہل سیر کی نظر سے بالکل

[1] سیرۃ النبیؐ: مقدمہ ص ۱۰۰ [2] ایضاً: ص ۸۳، ۸۴۔

اوجھل رہ گئے تھے"[1]

مذکورہ بالا بیان میں یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا گیا ہے کہ تمام ہی واقعات کتب حدیث سے ڈھونڈ کر مہیا کیے جائیں گے، جیسا کہ مولانا کے الفاظ "اکثر تفصیلی واقعات" سے بالکل عیاں ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض خوردہ گیر محض اعتراض کرنے کے شوق میں یہ کہنے سے باز نہیں آتے کہ مولانا شبلیؒ نے خود اپنے اصولوں سے انحراف کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے کمال کا دعویٰ نہیں کیا ہے اور کوئی بھی ہوش مند انسان یہ کرنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتا ہے (ان الکمال للہ وحدہٗ)۔

۴۔ انشاپردازی اردو ادب کے عناصر خمسہ میں صرف مولانا شبلی کو سیرت طیبہ لکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، اس مقدس اور برگزیدہ ذات گرامی سے مولانا کی حد درجہ محبت اور غایت تعلق نے سیرۃ النبیؐ کو ادب و انشا کا چمنستان اور اردو ادب عالیہ کا شہ پارہ بنا دیا ہے، اس کتاب کے "سرنامہ" اور "ظہور قدسی" کی عبارتوں پر توالہام کا شبہ ہوتا ہے، ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے مولانا کے قلم کی سحر طرازی اور بہار آفرینی کا اندازہ ہوگا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کے باب میں رقم طراز ہیں:

"دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا، قبول حق ایک طرف اس وسیع خطۂ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا تھا، حضرت ابراہیمؑ نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا، مصر آئے ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا، فلسطین پہونچے کسی نے بات تک نہ پوچھی، خدا کا جہاں نام لیتے تھے شرک و بت پرستی کے غلغلے میں

[1] سیرۃ النبیؐ: مقدمہ ص ۵۳۔۵۴۔

آواز دب دب کر رہ جاتی تھی، معمورۂ عالم کے صفحے نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے، اب ایک سادہ بے رنگ ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا ورق درکار تھا، جس پر طغرائے حق لکھا جائے، یہ صرف حجاز کا صحرائے ویراں تھا جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا[1]۔

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیلؑ نے قربانی کی جو بے مثال یادگار قائم کی ہے، اس کی منظر کشی مولانا شبلیؒ کے سحر بیان قلم سے ملاحظہ ہو:

"اب ایک طرف نود سالہ پیر ضعیف ہے، جس کو دعاہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لیے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ کا ہر پدر ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے، ملائکہ قدسی فضائے آسمانی عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے آواز آتی ہے:

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا	ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا، ہم
إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝	نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

طفلیان ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیلؑ   در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند[2]

غزوات کے ذکر میں مغازی کی داستانوں سے مستشرقین کی خاص دلچسپی کا تذکرہ

[1] سیرۃ النبی: مقدمہ تاریخ عرب قبل اسلام، ص ۱۵۳، [2] ایضاً: ص ۱۵۸، ۱۵۹۔

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کیا عجیب بات ہے کہ ارباب سیر مغازی کی داستان جس قدر دراز نفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں یورپ اسی قدر اسکو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے کیونکہ اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے، اس کے نقش و نگار کے لیے لہو کے چند قطرے نہیں چشمہائے خون درکار ہیں"[1]

یہ چند مثالیں اِدھر اُدھر سے پیش کر دی گئی ہیں، مقصود تفصیل نہیں ہے ورنہ سیرۃ النبیؐ از اول تا آخر مولانا کی انشار پردازی اور ادبی لالہ کاری سے بھری ہوئی ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست   بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

تحقیق و تلاش کی محنت مذکورہ بالا خصوصیات پر مشتمل اس اہم کتاب کی تالیف کے دوران مولانا شبلی کو کیسی محنت اور عرق ریزی کرنی پڑی ہے' اس کا کچھ اندازہ مولانا شیروانی کے نام انکے درج ذیل مکاتیب سے کیا جا سکتا ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سیرت کے لیے ایشیاٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں دیکھنی ہیں ..... سیرت کا ماخذ اصلی صرف تین کتابیں ہیں' ابن ہشام' ابن سعد' طبری ان کے تمام رواۃ کا استقصاء کر کے ان کا اسماء الرجال تہذیب وغیرہ سے مرتب کرا رہا ہوں کہ روایتوں کے انتقاد میں آسانی ہو' سید سلیمان یہ کام کر رہے ہیں اور وہ یہیں ہیں، خود الگ سیرت میں مشغول ہوں، انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے"[2]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"پہلی جلد کا نصف حصہ گویا تیار ہے، ہر ہفتہ میں طبیعت دو تین روز ناساز

[1] سیرۃ النبیؐ: جلد اول' ص ۴۰، ۳۰، [2] مکاتیب شبلی حصہ اول' ص ۲۰۰-۲۰۱۔

ہو جاتی تھے، اس لیے ناغہ سے ہرج ہوتا ہے۔ بڑے بڑے معرکے طے ہوئے، اس فن کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت تھی، مجھ کو خود خیال نہ تھا کہ ایسی کامیابی ملے گی، لیکن قدر کون کرے گا۔ کوئی شخص پہلے طبری وابن اثیر کو چھان چکا ہو تب اندازہ کر سکتا ہے۔"[1]

سیرۃ النبیؐ کی تالیف کے سلسلہ میں مولانا بمبئی میں مقیم تھے، اسی دوران مولانا ابوالکلام آزاد نے ان سے کلکتہ آنے کی فرمایش کی تو ان کو جواب میں لکھا:

"کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے، لیکن کیا کروں سیرت کے لیے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں، ان کو کہاں کہاں لیے پھروں، یہاں سورتی سے استعارۃً بھی کتابیں مل جاتی ہیں، اس پر بھی بہت سی خریدنی پڑیں، ایک کافی ذخیرہ ساتھ آیا تھا، پھر بھی ہر قدم پر ضرورت پیش آتی ہے۔"[2]

مقدمہ سیرت کی الہلال میں اشاعت سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد کا مسودہ کافی حد تک لکھا جا چکا تھا اور اس کی شہرت پورے ملک میں ہو چکی تھی، چنانچہ مولانا نے مقدمہ سیرت کے کچھ اجزا الہلال میں چھاپنے کے لیے بھیجے تاکہ اہل علم اس کے بارہ میں رائے و مشورہ دے سکیں، یہ اجزا "دیباچۂ سیرت نبویؐ" کے عنوان سے ۲۲ جنوری تا ۱۲ فروری ۱۹۱۳ء کے شماروں میں بالترتیب چار قسطوں میں شایع ہوئے اور اس کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مفصل ادارتی نوٹ بھی تحریر کیا جس کے اخیر میں یہ لکھا کہ:

"آج کی اشاعت میں ہم دیباچۂ کتاب کا ایک ٹکڑا شایع کرتے ہیں جس کے مطالعے سے موضوع کتاب کے متعلق ناظرین کو نہایت مفید بصیرت حاصل ہوگی۔ اس کے بعد اصل کتاب کے بعض اہم حصے بھی شایع کیے جائیں گے، ان علمائے کرام سے جن کو فن سیرت و روایت سے

[1] مکاتیب شبلی حصہ اول: ص ۲۰۵ [2] ایضاً: ص ۲۸۴۔

دلچسپی ہے خاص طور پر امید کی جاتی ہے کہ وہ بتعمق نظر ملاحظہ فرمائیں گے اور کوئی امر قابل بحث و مذاکرہ یا مشورہ ضروری ان کے خیال میں آئے گا تو اسے دفتر سیرت نبویؐ یا صفحات الہلال تک پہونچانے میں دریغ نہ فرمائیں گے۔

یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ابھی تک کتاب کے تمام ٹکڑے محض مسودہ کی حالت میں ہیں، ممکن ہے کہ جو ٹکڑے شایع کیے جائیں ان میں عندالاشاعت بہت سی تبدیلیاں ہو جائیں، سردست مقصود صرف بغرض مشورہ و تبادلہ آرا و بحث و مذاکرہ ان کی اشاعت ہے۔"[1]

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس درخواست پر الہلال میں محض دو مراسلے شایع ہوئے، ایک مراسلہ حکیم غلام غوث صاحب (بہاولپور) کا بعنوان "سیرۃ نبویؐ" ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء کے شمارہ میں طبع ہوا اور دوسرا "سیرت نبویؐ اور نقد روایات و آثار" کے عنوان سے مولوی محمد اسحاق صاحب مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ کا ۲۱ و ۲۸ مئی ۱۹۱۳ء کے شماروں میں شایع ہوا، ان کے علاوہ کوئی اور مراسلہ الہلال کو موصول نہیں ہوا، ظاہر ہے کہ دیباچہ کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر صرف یہ دو مراسلے بحث و مذاکرہ کے لیے کافی نہیں تھے، چنانچہ مولانا آزاد نے اس پر اپنے تاسف کا اظہار بھی کیا ہے، حکیم غلام غوث صاحب کے مراسلہ کے جواب میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"دیباچۂ سیرت نبویؐ کی اشاعت سے مقصود یہی تھا کہ ارباب مشورہ مذاکرہ کی راہ پیدا کریں مگر جیسا کہ میرا پیشتر سے خیال تھا، ان امور کی نسبت بدمذاقی اور بے حسی اس درجہ عام ہے کہ کسی نے اس طرف توجہ نہ کی، صرف کلکتہ سے ایک صاحب (مولوی محمد اسحاق صاحب) نے ایک ضمنی امر کی نسبت تحریر بھیجی تھی جو آیندہ نمبر میں شایع کر دی جائے گی۔"[2]

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولوی محمد اسحاق صاحب نے اپنے مراسلہ میں گو ایک ضمنی

[1] الہلال مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۱۳ء، ص ۸ [2] ایضاً، مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء ص ۱۰۔

امر کی جانب توجہ دلائی تھی تاہم مولانا شبلی نے وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے سیرت کے اصل مسودہ میں ضروری ترمیم و تنسیخ کی۔

حکیم غلام غوث صاحب نے اپنے مراسلہ میں علمائے دیوبند سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ دیباچہ کے متعلق بحث و مذاکرہ میں حصہ لیں، وہ لکھتے ہیں:

"نہیں معلوم کہ الہلال مدرسہ عالیہ دیوبند میں جایا کرتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جاتا تو جب تک نونہ شایع ہوتا رہے آپ براہ کرم ایک پرچہ الہلال کا مدرسہ عالیہ دیوبند میں بھیج دیا کریں۔ آپ کو اجر عظیم ہوگا اور مدرسہ عالیہ دیوبند کے علماء سے بکمال الحاح عرض کی جاتی ہے کہ مشورہ سے دریغ نہ کریں"[1]

مگر یہ تمام درخواستیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں اور اس کے برعکس علماء کے ایک مقدس گروہ نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ نہایت افسوسناک ہے۔

سیرۃ النبیؐ کے خلاف علماء کی محاذ آرائی

پہلے گذر چکا ہے کہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ اسکا غلغلہ پورے ہندوستان میں مچ گیا اور لوگ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگے، اس سے کچھ موقع پرست لوگوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، جس کا ذکر حکیم غلام غوث صاحب نے بھی اپنے مراسلہ میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

"آپ جانتے ہیں کہ ایسی سیرۃ نبویؐ زمانہ کے لیے ضروری ہے، نہ صرف ضروری بلکہ اشد ضروری۔ غنیمت ہے کہ لوگ بھی ضرورت محسوس کرکے سیرت کی طرف جھکے ہوئے ہیں کئی یاروں نے جلب فائدہ کے لیے پیغمبر عالمؐ اور سوانح عمری پیغمبرؐ وغیرہ کے نام سے کتابیں طیار کرکے بیچنا شروع کر دیا ہے،

[1] الہلال، مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۱۰۔

لیکن ہر طرف سے سیرۃ نبوی شبلی کی طرف آنکھ لگی ہوئی ہے، اس شوق و شغف کو دیکھکر میں یہ کہنے کی جرات کر سکتا ہوں کہ یہ کتاب نہیں بلکہ ایک معجون اسلامی ہے جس سے حرارت دینی کا ارتعاش ہو جائے گا.....[1]

سیرۃ النبیؐ کی تالیف کے مصارف کی ذمہ داری نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال نے اپنے ذمہ لی تھی، جس کا ذکر مولانا شبلی نے اپنے ان اشعار میں کیا ہے:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں بہرصورت — کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی — تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل — کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

چنانچہ علماء کی مقدس جماعت جو ایک طرف سیرۃ النبیؐ کے مقابلہ میں کتاب سازی میں مشغول تھی اس کو یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ نواب صاحبہ کی سرپرستی میں جو سیرت نبوی لکھی جائے وہ مولانا شبلی کے قلم سے ہو، وہ اس کے منتظر بیٹھے تھے کہ سیرت کا کوئی صفحہ منظر عام پر آئے اور وہ اعتراضات کی بوچھار کر دیں، دیباچہ سیرت نبویؐ کی اشاعت کے بعد انہوں نے جو روش اختیار کی، اس کی پوری تفصیل مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

"یہ مقدمہ (دیباچہ سیرت نبوی) نکلا تو مولوی عبد الشکور صاحب ایڈیٹر النجم نے اپنے نقطۂ نظر سے اس پر نہایت سخت تنقید لکھی، مخالفین نے جن میں دیوبند کے کچھ لوگ بھی تھے اس تنقید کو دستاویز بنا لیا، اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا اور بعض ذرائع سے وہ سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم تک پہنچائی گئی، انہوں نے مولانا سے حقیقت حال دریافت فرمائی اور اس کے جواب لکھنے کی فرمایش کی، ...... مولانا نے منشی محمد امین صاحب

[1] الہلال، مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۱۰۔

" (لٹریری سکریٹری نواب صاحبہ) کو لکھا کہ: "نہایت مہمل اور معاندانہ اعتراضات ہیں....."

اور سرکاری مراسلہ کے جواب میں لکھا کہ سرکار عالیہ کسی مستند عالم کو تجویز فرمائیں تاکہ مسودہ اس کے پاس بھیج دیا جائے اور اپنی طرف سے شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی کا نام اس کام کے لیے تجویز فرمایا، چنانچہ مولانا نے مولانا محمود الحسن کی خدمت میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے ذریعہ سے اپنی خواہش پیش کی اور ساتھ ہی اپنا مسودہ بھی مولانا سندھی کے پاس بھیج دیا کہ وہ اس کو لے کر مولانا محمود حسن صاحب کی خدمت میں جائیں، لیکن اس تجویز کا جو حشر ہوا وہ ان ہی کی زبان سے سنیے: "آج ان کا (مولانا عبید اللہ سندھی کا) خط آیا کہ وہ گئے، لیکن دیوبند پارٹی کو بھوپال سے اطلاع مل چکی تھی، ان لوگوں نے مولوی محمود حسن صاحب کو باز رکھا کہ وہ مسودے کو سرے سے دیکھنا ہی منظور نہ کریں، دیوبند کے خیالات سے مولوی محمود حسن صاحب فی نفسہ الگ ہیں، چنانچہ مولوی عبید اللہ صاحب سندھی کو ان لوگوں نے کافر بنا دیا، لیکن مولوی محمود حسن صاحب کے تعلقات اب تک ان سے رہے ہیں، بہرحال اب غور کرنا چاہیے کہ کیا کیا جائے، چونکہ مولویوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے اس لیے سردست اور کوئی مولوی مسودہ دیکھنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے گا ورنہ سمجھے گا کہ برادری سے خارج ہونا پڑے گا"[1]

بالآخر معاندین کی یہ تمام کوشش رائیگاں گئی اور نواب سلطان جہاں بیگم کو یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ چند مولویوں کی محض ایک معاندانہ حرکت ہے۔

(باقی)

---

[1] حیات شبلی: ص ۷۱۶-۷۱۸۔

سجدۂ تحیۃ پر حضرت محبوب الٰہی کی مفصل بحث

از مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دہلوی۔

"اس مضمون میں سجدۂ تحیت کے متعلق حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا نقطۂ نظر بیان کر کے اس کی تشریح و توجیہ کی گئی ہے لیکن اس مسئلہ کے دوسرے پہلو یعنی کتاب و سنت سے اس باب میں کیا صراحتاً ثابت ہوتا ہے، یا تو سرے سے مضمون نگار نے تعرض نہیں کیا ہے اور اگر کیا بھی ہے تو بہت سرسری، اس لیے اگر کوئی صاحب علم دوسرے پہلو پر مدلل بحث کریں گے تو اسے بھی معارف میں شایع کیا جائے گا، اس کا نقطۂ نظر وہی ہے جو کتاب و سنت سے ثابت ہے۔

چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم"

(معارف)

راقم نے حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ (وفات ۷۲۵ھ) کے ملفوظات فوائد الفواد پر تشریحی اور تحقیقی کام کیا ہے، جو فوائد الفواد کے علمی مقام کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔

حضرت شیخؒ کے یہ ملفوظات حضرات صوفیہ کے ملفوظات میں نہایت مستند تسلیم کیے گئے ہیں اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے ان ملفوظات کو مشائخ چشتیہ کا معمول قرار دیا ہے

شیخ علیہ الرحمہ نے اپنی مختلف مجلسوں میں مشہور نزاعی مسئلہ (سجدۂ تحیۃ و تعظیم) پر

نہایت واضح کلام کیا ہے، ذیل میں وہ بحث پیش کی جارہی ہے۔

"اس کے بعد خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے اس بارے میں حکایت بیان فرمائی کہ انہی گزشتہ دنوں میں ایک شخص آئے، بزرگ زادے تھے، سیاحت کیے ہوئے اور شام و روم دیکھے ہوئے۔ جب وہ آکر بیٹھے تو اسی دوران وحید الدین قریشی آئے اور جیسا کہ خدمت گاروں کی رسم ہے، آداب بجالائے اور سر زمین پر رکھا۔ یہ صاحب جو بیٹھے تھے پکار کر بولے کہ ایسا کرنا سجدے کی اجازت کہیں نہیں آئی ہے۔ اس بارے میں جھگڑا کرنے لگے، میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں جواب دوں۔ (لیکن) جب بات بہت بڑھ گئی اور وہ اس بارے میں بہت غلو کرنے لگے تو میں نے ان سے بس اتنا کہا کہ سنو اودھم مت مچاؤ۔ جو بات کبھی فرض رہی ہو جب اس کی فرضیت چلی جاتی ہے تو استحباب باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ ایام بیض اور ایام عاشورہ کے روزے ماضی کی امتوں پر فرض تھے۔ رسول علیہ السلام کے زمانے میں چونکہ ماہ رمضان کا روزہ فرض ہوا تو ایام بیض اور ایام عاشورہ کے روزہ کی فرضیت اٹھ گئی لیکن استحباب باقی رہا۔ اب سجدے پر آتا ہوں۔ ماضی کی امتوں میں یہ مستحب تھا۔ چنانچہ رعیت بادشاہ کو اور شاگرد استاد کو اور امت پیغمبر کو سجدہ کیا کرتی تھی، جب عہد رسول علیہ السلام آیا تو یہ سجدہ نہ رہا۔ البتہ اگر استحباب چلا گیا تو اباحت رہی۔ اگر مستحب نہیں تو مباح ہوگا۔ مباح سے انکار نہیں اور ممانعت کہاں سے آئی ہے؟ کوئی ایک ہی مجھے بتادو۔ خالی خولی انکار سے کیا ہوتا ہے؟ جب میں نے یہ کہا تو وہ چپکے ہوئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر یہ حکایت پوری فرما چکے تو ارشاد کیا کہ میں پشیمان ہوا کہ میں نے اتنی بات بھی ان سے کیوں کہی جس سے وہ دل شکستہ ہوگئے ہوں مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ دو چیزیں دل سے میں پشیمان ہوا، ایک تو اس چیز سے کہ ان سے

ایسی بات کیوں کہی جس سے ان کی گرفت ہوئی، دوسرے یہ کہ وہ مسافر تھے اس لیے مجھے انہیں کچھ دینا چاہیے تھا۔ اگر کپڑا یا نقدی یا اور کوئی چیز ان کو دیتا تو اچھا ہوتا۔ انہی دو چیزوں سے مجھے پشیمانی ہوئی، اس کے بعد کسی کو کچھ پیش کرنے کے بارے میں فرمایا کہ شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا تھا جو بھی تمہارے پاس آئے تمہیں چاہیے کہ اس کو کچھ دو۔

اس مباحثے کی مناسبت سے حکایت بیان فرمائی کہ ایک دفعہ کوئی بوڑھا شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں شیخ قطب الدین بختیار طیب اللہ ثراہ کی خدمت میں رہا ہوں اور آپ کو وہاں دیکھا ہے، شیخ نے اسے نہیں پہچانا، جب اس نے مزید تعارف کرایا تو پہچانا۔ الغرض یہ بوڑھا ایک جوان کو بھی ساتھ لایا تھا اور وہ اس کا لڑکا تھا، اس درمیان بات میں سے بات نکلی تو اس لڑکے نے بے ادبی سے حجت کی اور گستاخی کے انداز میں شیخ سے بحث کرنی شروع کی اس طرح کہ اونچا بولا۔ شیخ نے بھی آواز بلند فرمائی، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرماتے ہیں کہ میں اور مولانا شہاب الدین جو شیخ کے صاحبزادے تھے ہم دونوں دروازے کے باہر بیٹھے تھے جب زیادہ شور ہوا تو اندر آئے وہ لڑکا بے ادبی سے گفتگو کر رہا تھا، مولانا شہاب الدین نے اندر آکر اس لڑکے کے طمانچہ مارا، لڑکے نے غصے ہو کر چاہا کہ مولانا سے بے ادبی کرے، میں نے اس لڑکے کے ہاتھ پکڑ لیے، اس درمیان شیخ کبیر قدس سرہ نے فرمایا: صلح صفائی کرو، مولانا ایک عمدہ کپڑا اور کچھ نقدی لائے اور ان دونوں کو وہ سامان دے کر انہیں رخصت کر دیا۔" (فوائد: جلد دوم، مجلس ۳۰)

اس مسئلہ میں اصولی بحث یہ ہے کہ سجدۂ تحیۃ باوجود شرک جلی نہ ہونے کے

شریعت اسلامیہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ تعظیمی رسم فعل مباح کی حیثیت رکھتی ہے، تصوف میں اس فعل کے مباح قرار دینے کی مصلحت پر ملفوظات کے مرتب خواجہ حسن سنجری علیہ الرحمہ نے شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے ان الفاظ میں روشنی ڈالی، شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا:

"ہر من خلق مے آید و روے بر زمیں مے آرد۔ یعنی میرے پاس لوگ آتے ہیں اور زمین پر سر رکھتے ہیں تو میں انہیں منع نہیں کرتا کیونکہ حضرت قطب صاحب اور بابا صاحب علیہم الرحمہ منع نہیں کیا کرتے تھے"۔

شیخ حسنؒ نے عرض کیا:

ایں کس کہ پیش مخدوم مے آید و روے بر زمین مے آرد و از مزیدی حاصل مے شود و نفس او مے شکند اما مخدوم بزرگ کردہ خدا ایست عز و جل بزرگی او بخدمت کردن مرید متعلق نیست (۲۲)

اگر کوئی شخص مخدوم کے سامنے آتا اور زمین پر سر رکھتا ہے تو اس فعل سے اسے کچھ حاصل ہوتا ہے اور اس کی نفسانیت ٹوٹتی ہے اور مخدوم (شیخ علیہ الرحمہ) تو خدا تعالیٰ کی طرف سے محترم بنائے گئے ہیں، آپ کی بزرگی کسی مرید کے احترام کرنے پر موقوف نہیں ہے۔

خواجہ حسنؒ نے کس خوبصورتی کے ساتھ اس رسمی فعل تعظیم کی مصلحت پر روشنی ڈالی ہے اور اس رسمی تعظیم کو عبادت الٰہی (حقیقی تعظیم) سے الگ کیا ہے، علماء اور صوفیہ دونوں طبقوں میں حضرت امام حسن بصری علیہ الرحمہ کی علمی اور روحانی جلالت و عظمت مسلم و مشہور ہے

حضرت امام باقر ابن امام زین العابدین فرماتے تھے:

"حسن کا کلام حضرات انبیائے کرام کے کلام سے ملتا جلتا ہوتا ہے"۔

حضرت امام حسن بصری قرآن کریم کی صفت شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (یونس ۱۰: ۵۷) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ قرآن کریم کی یہ صفت بتا رہی ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا اصلی مقصد روحانی بیماریوں کا علاج ہے، جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں (معارف القرآن جلد ۴، ص ۵۴۲ بحوالہ روح المعانی)

حضرت امامؒ قرآن کریم سے شفائے جسمانی کے حصول کی نفی نہیں فرما رہے ہیں، بلکہ اسے مقصد نزول سمجھنے کی تردید فرما رہے ہیں اور مسلمانوں کو اصلی مقصد کی طرف توجہ قائم رکھنے کی ہدایت فرما رہے ہیں اور یہ ہدایت سد باب کے اصول پر ہے، یعنی دروازہ بند کرنا ہے اور حضرت امام حسن کے سامنے یہ دور فتن تھا جس میں مسلمانوں نے قرآن کریم کے اصلی مقصد کو پس پشت ڈال کر اسے صرف عملیات کی ایک کتاب بنا کر رکھ دیا ہے۔

محدثین اور فقہائے اسلام کا طبقہ منکرات شرعی کی روک تھام کے لیے "سد باب" کے فقہی اصول کے مطابق حزم و احتیاط کی جس مصلحت پر نظر رکھتا ہے وہ اصول صوفیائے ربانی کے پیش نظر بھی رہا ہے

امام العارفین شیخ ابن عربی علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور کتاب فتوحات مکیہ میں اسی اصول پر یہ تحریر فرمایا ہے:

"مومن کے حق میں سب سے بڑی دینی آزمائش یہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (یوسف ۱۲: ۱۰۶)

اکثر لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ وہ شرک بھی کرتے ہیں۔

میں اشارہ کے طور پر کہتا ہوں کہ اس آیت میں شرک سے شرک خفی مراد ہے جو ایمان

کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے" (فتوحات جلد ۴، ص ۵۹۳)

مطلب یہ کہ جو امور شرک خفی کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی شرک جلی کے ساتھ شکل ظاہری اور صورت ظاہری میں مشابہت رکھتے ہیں اور جن کے ارتکاب سے شرک جلی کے پھیلنے کا اندیشہ اور خطرہ ہوتا ہے وہ مسلمانوں کے حق میں بڑی آزمائش ہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ کا انقباض | جلد ۴ مجلس (۶۶) ص ۹۱۳ میں خواجہ حسن سنجری علیہ الرحمہ نے اپنے شیخ کے سامنے اس رسم ادب کا ذکر چھیڑا اور ان الفاظ میں چھیڑا:

مریداں بخدمت مخدوم مے آیند
و سر بر زمین مے نہند خواجہ ذکرہ اللہ
بالخیر فرمود کہ من مے خواستم کہ خلق
را منع کنم اما چوں پیش شیخ من ہم
چنیں کردہ اند منع نکردم

مخدوم محترم کی خدمت میں مرید حاضر
ہوتے ہیں اور زمین پر سر رکھتے ہیں،
خواجہ علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ میں چاہتا
ہوں کہ منع کر دوں مگر چونکہ میرے شیخ
کے سامنے ایسا ہوتا تھا اور وہ منع نہیں
فرماتے تھے اس لیے میں بھی منع نہیں کرتا۔

پہلی بات تو یہ کہ مرتب علیہ الرحمہ نے بھی اپنے شیخ کی پیروی میں سجدۂ تعظیمی کی تعبیر سے احتراز فرمایا اور " بر زمین مے نہند" کہہ کر یہ مسئلہ چھیڑا۔

دوسری بات یہ کہ شیخ علیہ الرحمہ نے اس موقع پر جو الفاظ فرمائے ان سے شیخ علیہ الرحمہ کے اس مسئلہ کے بارے میں انقباض پیدا ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ منع کر دوں مگر اپنے شیخ کی پیروی مجھے روک دیتی ہے۔

یہ فقرے شیخ علیہ الرحمہ کی علمی بصیرت کی دلیل ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک

فعل مباح سے اگر کسی فعل منکر کا شبہ پیدا ہوتا ہے تو سد باب کے اصول پر اس سے احتراز کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے، اس گفتگو کے دوران شیخ الرحمہ کے قلب مبارک میں اس مصلحت دینی کا القا ہوا، جس کا اظہار شیخ علیہ الرحمہ نے صاف صاف فرمادیا۔

اسی مجلس میں شیخ علیہ الرحمہ نے حضرت بابا صاحب علیہ الرحمہ کے حوالہ سے شیخ ابو سعید ابوالخیر علیہ الرحمہ کا یہ واقعہ نقل فرمایا کہ شیخ اپنے گھوڑے پر تشریف لیجا رہے تھے کہ ایک مرید آیا اور اس نے شیخ کے گھٹنوں کو بوسہ دیا، شیخ نے فرمایا فروتر (اور نیچے) اس نے شیخ کے قدم چوم لیے، شیخ نے پھر فرمایا فروتر (اور نیچے) اس نے گھوڑے کے زانو کو بوسہ دیا، شیخ نے پھر فرمایا، فروتر، اب اس نے زمین کو بوسہ دیا، اب شیخ نے فرمایا:

دریں چہ ترا فرمودم کہ فروتر فروتر
مقصود من نہ بوسیدن زمین بودہ
است، تو ہر چہ فروتر مے شدی درجۂ
تو بالائے تر مے شدی۔

میں نے اور نیچے اور نیچے کا حکم اس لیے
نہیں دیا کہ میرا مقصود زمین کو بوسہ
دینا تھا، بلکہ بات یہ تھی کہ تو جتنا نیچے
جھکتا تھا اتنا ہی تیرا درجہ بلند ہوتا تھا۔

یہ وہی مصلحت ہے جس کو شیخ حسن سنجری نے نفس شکنی اور نفسانیت کا توڑنا قرار دیا ہے۔

زمین بوسی کی درباری رسم | ان حضرات مشائخ کے دور میں دربار شاہی میں تعظیم بجالانے کے طور پر زمین پر سر رکھنے کی رسم عام تھی اور اس رسم سے گریز کرنے کو شاہی آداب کی خلاف ورزی قرار دیا جاتا تھا، وہی رسم تعظیم بزرگوں کے سامنے بھی ادا کی جاتی تھی، اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس رسم سے گریز کرتا ہوگا اسکے اس رویہ کو بے ادبی شمار کیا جاتا ہوگا۔

ان بزرگوں کی طرف سے اس تعظیمی رسم کی ممانعت پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا،

اس کی وجہ کیا تھی؟

یہ بات ہمیں حضرت سید حسن رسول نما علیہ الرحمہ کی ایک مجلس کی روداد سے معلوم ہوئی، حضرت سید صاحب عہد عالمگیری کے مشہور صاحب علم و روحانیت ولی تھے، اُنکی سوانحعمری اُن کے شاگرد و مرید سید میر ہاشم نے دو جلدوں میں مرتب کی جو اردو ترجمے کی صورت میں (لوائح العرفان، فیضان حسن رسول نما) پاکستان سے شایع ہوئی ہیں۔

سید صاحب کی خاص دوستی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب محدث دہلوی کے ساتھ تھی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ایک چارپائی پر بیٹھ کر دیر تک گفتگو کیا کرتے تھے، عقائد میں سید صاحب محدثانہ تصورات کے حامل تھے، چنانچہ علم غیب محیط اور کلی کو ذات حق تعالیٰ کے ساتھ خاص قرار دیتے تھے۔

ان کی ایک مجلس میں شیخ دولت گجراتی (پنجاب) کا تذکرہ چھڑا، مجلس میں ایک سپاہی موجود تھا، اس نے شیخ دولت کے بارے میں بتایا کہ ایک روز میرے سامنے شیخ دولت کی مجلس میں ایک نقشبندی بزرگ تشریف لائے، شیخ کی مجلس میں زمین بوسی کی تعظیمی رسم کو دیکھ کر نقشبندی بزرگ نے فرمایا، یہ کیسی درویشی ہے کہ لوگ آپ کو سجدہ کریں اور آپ انہیں منع نہ کریں؟ شیخ دولت نے پنجابی زبان میں فرمایا، میرے بھائی! میں تو بہت منع کرتا ہوں، مگر یہ لوگ باز نہیں آتے، میں تو ایک غلام ہوں، مجھے ڈر ہے کہ اگر میں زیادہ زور دونگا تو یہ لوگ مجھ پر زیادتی کریں گے، آپ انہیں ضرور منع کریں، آپ تشریف فرما ہیں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک راجپوت فوجی سردار اپنے چند ساتھی سپاہیوں کے ساتھ مجلس میں آیا اور اس نے دستور کے مطابق زمین پر سر رکھدیا، یہ فوجی بادشاہ دہلی

کی طرف سے کابل میں مقرر کیا گیا تھا، کابل جاتے ہوئے شیخ دولت کی زیارت کرنے گجرات میں حاضر ہوا، شیخ نقشبندی نے اس فوجی کو زمین بوسی سے منع کیا، اس کے ساتھیوں نے شیخ پر تلواریں سونت لیں اور شیخ کے ساتھ بدتمیزی کی، شیخ اسوقت اگر سانس بھی لیتے تو وہ ان کو قتل کر دیتے۔ شیخ گھبرا گئے، اتنے میں اس فوجی سردار نے سر اٹھا لیا اور بات دب گئی اور وہ نذر پیش کر کے چلا گیا، یہ راجپوت سپاہی راجہ مان سنگھ تھا، جو اکبر کی فوج کا سپہ سالار تھا۔

وہ سپاہی جب یہ واقعہ نقل کر چکا تو مرتب فیضان حسن رسول نما سید نجیب الدین نے کہا، حضرت الشیخ دولت نے بہت جلدی اپنی کرامت دکھادی، سید صاحب نے فرمایا ہاں اس میں کیا شک ہے، (فیضان حسن رسول نما ص ۳)

مطلب یہ ہے کہ شیخ دولت نے اس واقعہ کی صورت میں نقشبندی بزرگ کے سامنے اپنے جواب کی عملی تصدیق پیش کر دی، حاصل یہ نکلا کہ زمین بوسی یا قدم بوسی کا رواج اس دور میں ایک تعظیمی رواج کے طور پر اتنا عام تھا کہ اس کی مخالفت کو شاہی آداب کی خلاف ورزی اور شاہی احترام سے سرکشی سمجھا جاتا تھا، یہی رسم بزرگوں کے ہاں بھی جاری ہوگئی اور انہوں نے اس کو کوئی پسندیدہ فعل نہیں سمجھا بلکہ ایک عام رواج کے طور پر اسے برداشت کیا۔

قدم بوسی کے مسئلہ میں کمال احتیاط | حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے زمین بوسی یا زمین پر سر رکھنے کے مسئلہ میں جو احتیاط اختیار کی ہے وہ بھی سماع کے مسئلہ میں کمال احتیاط کی طرح ہے (۱۸۸) مجلسوں میں شیخ علیہ الرحمہ اور شیخ کے فاضل مرید خواجہ حسن علیہ الرحمہ نے کسی گفتگو میں سجدہ کا لفظ زبان مبارک پر نہیں آنے دیا، کیونکہ صحیح احادیث

میں مطلق سجدہ کی ممانعت مذکور ہے۔

بزرگ زادہ کے ساتھ مباحثہ کے دوران سجدہ کا لفظ استعمال فرمایا کیونکہ سجدۂ تحیۃ کی اباحت اور جواز بتانا مقصود تھا، اگر آنے والے بزرگ زادہ یہ بحث نہ چھیڑتے تو شیخ علیہ الرحمہ اس فعل کو "رسم ادب" کے نام سے متعارف کرتے۔

پھر قدم بوسی (جو زمین پر سر رکھنے کی صورت ہے) کے ثبوت میں احادیث کے اندر وفد عبد القیس کے ممبران کا یہ بیان موجود ہے:

لما قدمنا المدینۃ فجعلنا	ہم جب مدینہ آئے تو ہم اپنی سواریوں
نتبادر من رواحلنا فنقبل	سے اتر کر جلدی کے ساتھ آگے بڑھے
ید رسول اللہ صلی اللہ	اور رسول پاکؐ کے دست مبارک
علیہ وسلم و رجلہ	اور آپؐ کے قدم مبارک کو بوسہ دیا۔

(مشکوۃ ص۴۰۲ بحوالہ ابوداؤد)

کس قدر احتیاط کی بات ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ زمین بوسی اور قدم بوسی کے جواز میں اس روایت کا چرچا نہیں کرتے، صرف یہ فرماتے ہیں کہ میرے مشائخ کے لیے ایسا ہوتا تھا اور وہ اسے منع نہیں کرتے تھے۔

"بعد ازاں فرمود کہ بر من خلق مے آید و روئے بر زمین مے آرد چوں پیش شیخ الاسلام فرید الدین و شیخ قطب الدین قدس اللہ روحہما العزیز منع نبود من ہم منع نمے کنم"

(مجلس (۳۰) جلد ۴ ص۴۲)

گفتگو کا انداز یہ بتا رہا ہے کہ متکلم کو ذاتی طور پر اس فعل سے شرح صدر نہیں ہے، اور نہ وہ اپنی ذاتی رائے کے طور پر مدلل انداز میں زمین پر سر رکھنے کی بات فرماتے ہیں۔

تفصیلی بحث (۱) پہلی بات تو یہ واضح رہے کہ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اس تعظیمی فعل کو سجدۂ تعظیمی کے الفاظ سے تعبیر نہیں فرمایا بلکہ فرمایا "رسم خدمت گاروسر بر زمین نہاد" یعنی آنے والے نے خدمت گاروں کی رسم ادا کی اور زمین پر سر رکھ دیا، اعتراض کرنے والے بزرگ زادہ نے اس رسمی آداب بجالانے پر سجدہ کے ناجائز ہونے کی بحث چھیڑ دی۔ شیخ علیہ الرحمہ نے زمین پر سر رکھنے کے فعل پر شرعی لفظ سجدہ کے اطلاق سے پرہیز فرمایا۔ کیونکہ سجدہ ایک شرعی اصطلاح ہے، حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے:

قال صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان	رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا مجھے خدا کی
اسجد علی سبعۃ اعظم علی الجبھۃ	طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں
واشار بیدہ الی الانف والیدین	پر سجدہ کروں پیشانی یعنی ناک پر،
والرکبتین واطراف القدمین	دونوں ہاتھوں پر دونوں گھٹنوں پر
(ابن کثیر، جلد ۳ ص۲۳۳)	اور دونوں قدموں کی انگلیوں پر۔

یہ سجدہ کی ظاہری شکل ہے اور حضورؐ کا اشارہ سجدۂ عبادت کی طرف ہے جس میں بندہ اپنی انتہائی عاجزی کے اظہار کے ساتھ اپنے مسجود (حق تعالیٰ) کی انتہائی عظمت کا اظہار کرتا ہے، یہ سجدہ بلا اختلاف خدا تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے سامنے جائز نہیں ہے، اب رہی صورت تعظیمی طور پر سر جھکانے کی جسے عرف عام میں تعظیمی سجدہ، سجدۂ تحیہ یا سجدۂ ادب کہا جاتا ہے، تو حقیقی سجدہ اور مشابہ سجدہ فعل کے بارے میں نیت اور قصد کے ذریعہ فیصلہ کیا جائے گا، محقق اسلام امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی اہم کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عبادت انتہائی طور پر عاجزی کے اظہار کا نام ہے، یہ تذلل اور اظہار ذلت دو

صورتوں میں ہوتا ہے۔ ایک ظاہری عمل کے ذریعہ یعنی قیام اور سجدہ (کھڑے ہونے اور سر جھکانے کے ذریعہ) دوسرے نیت و ارادہ کے ذریعہ۔

ولما ثبت سجود التحیه من	اور جب یہ بات ثابت ہے کہ ملائکہ
الملائکة لآدم علیه السلام	نے حضرت آدمؑ کو سجدۂ تحیۃ (ادب)
ومن اخوة یوسف لیوسف	کیا اور برادران یوسف نے حضرت
علیه السلام وان السجود اعلیٰ	یوسفؑ کو کیا اور سر جھکانا اور سجدہ
صورة التعظیم وجب ان لا	کرنا تعظیم کی انتہائی اعلیٰ شکل ہے تو
یکون التمیز الا بالنیة	ضروری ہوا کہ نیت و ارادہ کے
(حقیقت الشرک صنا)	ذریعہ امتیاز کیا جائے۔

یعنی قیام اور سجود کے ظاہری افعالِ تعظیم میں اگر فاعل کی نیت یہ ہے کہ وہ اس ہستی کے سامنے جھک رہا ہے جو کائنات ہستی میں سب سے زیادہ عزت و عظمت کی مستحق ہے یعنی خداوند عالم تو یہ فعل عبادت ہوگا۔ ....

بت پرست اپنے بتوں کو اسی عقیدہ کے ساتھ سجدہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کی عظمت اور اس کی صفت کارسازی و کارفرمائی میں شریک ہیں اور ہماری بندگی کے مستحق ہیں' اس لیے ان کا سجدہ شرک و کفر ہے''۔

اور اگر رعایا اپنے بادشاہ کے سامنے اور شاگرد اپنے استاد کے سامنے سر جھکاتا ہے یا قیام کرتا ہے اور اس کی نیت ایک بادشاہ اور استاد کی خدمت میں ادب و احترام کی ہوتی ہے اور وہ اپنے مولیٰ و مالک حقیقی کی عظمت کا تصور بھی بادشاہ و استاد کے اندر نہیں کرتا تو یہ فعل سجدۂ حقیقی نہیں ہے، صرف اظہار ادب ہے جس پر شرک کا حکم

نہیں لگایا جاسکتا۔ (ملخص از حجۃ اللہ البالغۃ)

ہاتھ چومنے کی مصلحت | جلد ۵، ۴۸ ویں مجلس میں درویشوں کے عمل دست بوسی کرانے پر بڑی عارفانہ مصلحت بیان فرمائی:

سخن دراں افتاد کہ خلق دست	مجلس میں یہ ذکر نکلا کہ لوگ درویشوں
درویشاں ببوسند و برکت خواہند	کے ہاتھ چومتے ہیں اور اس سے برکت
برلفظ مبارک راند کہ مشائخ و درویشاں	حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ زبان مبارک
کہ دست بوسیدن نے دہند نیت	سے ارشاد ہوا کہ مشائخ اور درویش
ایشاں ایں ہم مے باشد کہ مگر	جو اپنا ہاتھ چومنے کے لیے دیتے ہیں
دست مغفوری بدست ایشاں بیمد	تو اس سے ان کی نیت بھی یہ ہوتی ہے
	کہ شاید کسی بخشے ہوئے (جنتی) کا ہاتھ
	ان کے ہاتھ میں آجائے۔

کیا انداز ہے شیخ علیہ الرحمہ کی اخلاقی تربیت کا۔ خواجہ حسنؒ نے دست بوسی کا پہلو پیش کیا کہ مصافحہ کرنے والے اور ہاتھ چومنے والے بزرگوں سے برکت حاصل کرنے کے لیے یہ فعل کرتے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمہ بات کا رُخ بدل دیتے ہیں اور فرماتے ہیں' ہماری نیت تو یہ ہوتی ہے کہ کسی جنتی کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں آجائے اور ہمیں اس کی برکت حاصل ہو۔

بزم صوفیہ (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم)

یہ تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصانیف صوفیہ کے حالات و کمالات کا تذکرہ ہے جس میں حضرت نظام الدین اولیاء کے مفصل حالات بھی درج ہیں۔　　قیمت ۱۱۵ روپے

"منیجر"

عربی میں آزاد شاعری کا ارتقاء

از ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، کیرالا۔

محمد علی شاہ مصر اور ان کے بعد کے بادشاہوں نے تعلیمی وفود فرانس کو بھیجے اور طلبہ کثرت سے ڈگریاں حاصل کرکے مصر لوٹے۔ پھر جو مدرسۃ الالسن (زبانوں کا اسکول) رفاعۃ الطہطاوی کی نگرانی میں قائم ہوا اس نے ایک ہزار یورپی کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں کیے۔ الغرض یورپی ادب و شاعری کا جو اختلاط عربی شعر و ادب سے ہوا اس کے اثرات بھی ظاہر ہوئے۔ مصر میں جو ادبی تحریکیں اٹھیں انھوں نے بھی عربی شاعری پر مثبت اثرات مرتب کیے۔ فرانسیسی اور انگریزی کے اثرات کے نتیجہ میں عربی شاعری میں "الشعر المرسل" یعنی غیر مقفیٰ شاعری اور "الشعر الحر" آزاد شاعری ظاہر ہوئی۔

مرسل شاعری | مرسل شاعری یہ ہے کہ شاعر عربی اوزان میں سے کوئی وزن حسب مرضی اختیار کرلیتا ہے اور ان ۱۶ بحروں کی پیروی نہیں کرتا جن کو خلیل بن احمد نے ایجاد کیا تھا۔ کوئی ایک رکن یا دو رکن افاعیل تفاعیل سے لے لیتا ہے۔ اس کو تفعیلات کی شاعری کہا جاتا ہے۔ ایک تفعیلہ یا دو تفعیلات وہ استعمال کرتا ہے۔ وہ ارکان کا انتخاب بحروں سے کرتا ہے مگر خاص فرق و امتیاز مرسل شاعری کا یہ ہے کہ اس میں قافیہ مطلق نہیں ہوتا مگر وزن ہوتا ہے۔

آزاد شاعری | آزاد شاعری میں وزن ہوتا ہے، مگر جیسا شاعر پسند کرتا ہے قافیہ بھی

ہوتا ہے، مگر شعر دو مصرعوں پر منحصر نہیں ہوتا، یا ایک ایک مصرعہ کی شاعری ہے جسکو شطر کی شاعری کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مصرعہ کی شاعری اپنی خصوصیات رکھتی ہے اس میں وقفے ہوتے ہیں ہر وقفہ پر قافیہ ہوتا ہے۔ جب نظم شروع ہوتی ہے تو قافیہ پر پہلا مصرعہ ختم ہوتا ہے اور آخری مصرعہ بھی قافیہ پر مکمل ہوتا ہے ہر وقفہ پر قافیہ ہوتا ہے۔

آزاد شاعری میں قافیہ اور موسیقیت دونوں موجود ہیں، مرسل شاعری میں وزن تو آزاد شاعری کی طرح ہے لیکن اس میں قافیہ کا فقدان ہے، اس بنا پر نازک الملائکہ اس کو پھیکی شاعری قرار دیتی ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے، ہر شاعری کا اپنا حسن ہے عرب قافیہ پرست ہیں، لہٰذا اکثر نقاد مرسل اور آزاد شاعری کی مخالفت کرتے ہیں مگر عراقی شاعروں نے مارکسی شاعری کے اثرات سے اتنا زبردست شعری ذخیرہ پیدا کردیا ہے کہ اب آزاد اور مرسل شاعری کو کوئی شخص نظرانداز نہیں کرسکتا، اس کے علاوہ شعرائے مہجر نے آزاد شاعری کو خوب پروان چڑھایا، انھوں نے نثری شاعری بھی کی۔ امین الریحانی، جبران خلیل جبران اور احمد زکی ابو شادی نے اس میدان میں کافی جدوجہد کی۔ عبدالرحمٰن شکری نے اپنے قصائد "کلمات العواطف" (جذبات کے کلمات) "واقعۃ ابی خیر" اور نابلیون والساحر المصری (نپولین اور مصری ساحر) کو شعر حر کے قالب میں پیش کیا ہے۔ احمد زکی ابو شادی نے اپنے دیوان مسمّی "مختارات الوحی العام" میں آزاد شاعری کا تجربہ کیا، یہ دیوان ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ محمد فرید ابو حدید، ڈاکٹر محمد عوض محمد اور محمود حسن اسماعیل نے بھی شعر مرسل اور شعر حر کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ مگر یہ ابتدائی کوششیں تھیں جن کو ناقدوں کی رائے میں قبول عام حاصل نہیں ہوا، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ عرب ناقد جب آزاد شاعری (الشعر الحر)

کا ذکر کرتے ہیں تو فوراً اس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں، لویس شیخو لبنانی لکھتا ہے کہ آزاد شاعری:

اقرب الی الهذیان والسخف منها الی الکلام المعقول۔	آزاد شاعری کلام معقول کے مقابلہ میں ہذیان اور بیوقوفی سے زیادہ قریب ہے۔

ڈاکٹر طاہر احمد مکی اپنی کتاب الشعر العربی المعاصر میں رقمطراز ہیں کہ:

ولکن محاولتهم لم تلق ما ارادوا لها من قبول فاقلعوا عنها وانتهت المحاولة الی لاشئ	لیکن ان شاعروں کو مقبولیت اس حد تک حاصل نہ ہو سکی جتنا کہ وہ چاہتے تھے تو انہوں نے کوشش ترک کر دی اور اس کا انجام صفر رہا۔

پھر یہی ناقد آگے چل کر لکھتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد عربوں اور یورپ میں اختلاط بڑھا اور جو لوگ یورپ سے واپس آئے انہوں نے سیاست، معاشیات اور تعلیم کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی تجدید کی کوشش کی، یہ دراصل قافیہ سے پیچھا چھڑانے کی ایک تحریک تھی۔ تفاعیل سے نجات تو نہ مل سکی مگر وزن کی شکلیں بدل گئیں۔ طاہر احمد مکی لکھتے ہیں:

فتخلص الشعراء والصغار منهم بخاصة من القافیة ومن الوزن والجملة من کل شئ لینتهوا الی لاشئ ایضاً[1]	تو شعراء نے خصوصاً چھوٹے شاعروں نے قافیہ اور وزن بلکہ تمام عروضی قواعد سے نجات حاصل کر لی تاکہ ایسے مقام پر پہونچ جائیں جو صفر ہے۔

[1] اس پوری بحث کیلئے دیکھئے الشعر العربی المعاصر از طاہر احمد مکی طبع ثالث دار المعارف مصر ص ۱۵۰۔۱۵۱۔

درحقیقت عرب ادیبوں اور ناقدوں کی اکثریت شعر مرسل اور شعر حر کی مخالف رہی ہے، مذکورہ دونوں اقتباسات اسی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں، طاہر احمد مکی جدید ناقد ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ آزاد اور مرسل شاعری دونوں عربی شاعری کی نہایت کامیاب اصناف ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مشہور عراقی شاعر عبد الوہاب البیاتی شاعر نہیں ہے، بیاتی نے ہزاروں اشعار موزوں کیے اور سب مرسل اور آزاد شاعری میں۔ اس نے نہایت عظیم فنی وفکری قصائد پیش کیے۔ وہ ایک مارکسی شاعر ہے۔ اس پر آٹھ دس ڈاکٹریٹ کے مقالے لکھے جا چکے ہیں اس کامیابی کے بعد یہ کہنا کہ آزاد شاعری کو صرف چھوٹے شاعروں نے اختیار کیا اور وہ بھی ناکام رہے نہایت افسوسناک تعصب ہے۔

حق یہ ہے کہ جو شخص بھی عبد الوہاب بیاتی، صلاح عبد الصبور اور محمد الفیتوری کا کلام دیکھے گا۔ جو سب کا سب مرسل اور آزاد شاعری میں ہے۔ وہ عربی شاعری میں اس صنف کی کامیابی پر متحیر رہ جائے گا اور تسلیم کرے گا کہ عربی زبان میں آزاد شاعری ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر چکی ہے۔ وہ اس میدان میں کسی زبان کی شاعری سے پیچھے نہیں ہے۔ البیاتی، صلاح عبد الصبور اور محمد الفیتوری نہایت اعلیٰ درجہ کے فنکار ہیں انکی فنی عظمت، بلند آہنگ نغمہ اور الفاظ وتراکیب کا دروبست ان کو صف اول کے ممتاز شعراء میں حیات ابدی دینے کا ضامن ہے، ان عظیم فنکاروں کے وجود میں آنے کے بعد آزاد شاعری کے خلاف بعید از حقیقت تبصرہ کرنا اپنے تعصب کا پردہ فاش کرنا ہے۔ میں اپنے دعویٰ کی دلیل کے طور پر مذکورۂ بالا تینوں شاعروں میں سے بیاتی کا کلام مختصراً کے ساتھ پیش کرتا ہوں تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ عربی شاعری میں جدید شاعری اور آزاد شاعری کتنی ترقی یافتہ ہے، بیاتی کے بعد محمود غنیم کا ایک قطعہ بھی مع ترجمہ

پیش خدمت ہے:

عبدالوہاب بیاتی ایک عظیم اشتراکی شاعر ہے، وہ کہتا ہے کہ:

لوان الفقر انسان اذن لقتلته — اگر فقر انسان ہوتا تب تو میں اس کو

و شربت من دمه۔ — ضرور قتل کر ڈالتا اور اس کا خون پی لیتا۔

وہ الرایۃ الحمراء (لال جھنڈا) میں لکھتا ہے کہ:

المجد للانسان — عظمت انسان کے لیے ہے۔

لعالم یولد تحت الرایۃ الحمراء — ایک ایسے عالم کے لیے جو لال جھنڈے کے تحت پیدا ہوگا۔

یا رفیقنا تیلماك — اے میرے ساتھی تیلماک

فانہض — تو اٹھ کھڑا ہو

فان الحب والامان — محبت اور امن

والخبز للجمیع — اور سارے انسانوں کے لیے روٹی

فی بلادك الخضراء — تیرے ہرے بھرے ملک میں

یا رفیقنا تیلماك — (لال جھنڈے تلے ملے گی) اے ہمارے رفیق تیلماک

اموت من اجلك — میں تیرے لیے مروں گا

تحت الرایۃ الحمراء — لال جھنڈے تلے

یا مدینۃ السلام — اے امن کے شہر بغداد

محمود غنیم کی ایک نہایت خوبصورت آزاد نظم بطور نمونہ کے پیش کرتا ہوں

اس میں وزن تو ہے مگر اس کا تعلق معروف بحروں سے نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے:

وضعونی علی النهر ودعونی — مجھے دریا پر پہنچا دو اور چھوڑ دو

انا والماء والشجر فی سکون — میں، پانی اور درخت سکون کی حالت میں رہیں۔

املاء السمع والمنظر بالفنون — کان اور منظر کو میں بھروں فنون سے یعنی کان اور آنکھ کے سامنے طرح طرح کی دلکش چیزیں آئیں۔

ثم افضی الی القمر بشجونی — پھر میں چاند کی طرف متوجہ ہوں گا اپنے غموں کے ساتھ

لیس سری لدی البشر بمصون — اس لیے کہ میرے راز انسان کے پاس محفوظ نہیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ ان اشعار میں حسن وزیبائی اور بڑی شاعرانہ دلکشی ہے۔

شعراء مہجر جنھوں نے لبنان سے امریکہ کو ہجرت اختیار کی تھی انھوں نے قدیم شاعری پر شدید حملے کیے اس کے اسلوب، موضوعات، الفاظ، قالب اور اوزان کے خلاف بغاوت کی، انھوں نے مدح، ہجو، تہنیت، مرثیہ اور اس طرز کے روایتی موضوعات کو ترک کردیا۔ انھوں نے اپنی ساری توجہ فطرت اور قدرتی مناظر پر مرکوز کی۔ انھوں نے نفس انسانی کی مکمل ترجمانی کی۔ انھوں نے دعوت دی کہ شہر اور شہریت کو خیرباد کہو اور چل کر جنگل میں زندگی بسر کرو تاکہ فطرت کی سادگی نصیب ہو۔ شہروں میں تصنع، تکلف اور شور و غوغا ہے۔ شمالی امریکہ کے مہاجرین جنکے میر کارواں،

جبران خلیل جبران تھے، انہوں نے حریتِ نفس پر زور دیا۔ جمالِ فطرت پر ابھارا اور قدیم شاعری کے موضوعات کے ساتھ ساتھ اوزان سے بھی بغاوت اختیار کی۔ یہ مہاجرین صحیح معنوں میں مجدد تھے اپنے اسالیب، اپنی زبان اور اپنے موضوعات میں اور اپنے شعری قالب میں بھی۔ انہوں نے ایک قافیہ ایک وزن ایک نظم میں استعمال نہیں کیا بلکہ ایک ہی قصیدہ[1] میں کئی وزن اور کئی قافیے استعمال کیے۔ یہ لوگ، وزن، قافیہ اور الفاظ کو ثانوی اہمیت دیتے ہیں شاعر یہاں قدیم الفاظ کے ذخیرہ سے اور قدیم شاعری کے اسلوب، تعبیر اور قالب سے قطعاً آزاد ہے۔ اسی بنا پر ایک وہ شخص جو قدیم عربی شاعری بلکہ جدید شعراء میں محافظین شعراء کے کلام سے لطف لیتا رہا ہے وہ اگر ان شمالی امریکہ کے مہاجرین شعراء کا کلام پڑھے گا تو وہ اس کو شاعری تسلیم نہ کرے گا، اس میں عربی شاعری کا رنگ موجود نہیں ہے یہ عربی شاعری کے قدیم انداز پر موزوں نہیں کی گئی ہے۔ البتہ اگر وہ بار بار نئی شاعری کو پڑھے اور اس کا ذوق اپنے اندر پیدا کرے تب بے شک وہ اس طرز شاعری میں لذت محسوس کرے گا اور ممکن ہے کہ اس وقت قدیم شاعری میں اس کو مزہ نہ آئے، انکے شعر کی فنی عظمت الفاظ اور قالب کی زینت میں نہیں ہے بلکہ افکار، معانی، روح اور جوہر میں ہے۔ اسی بنا پر اوزان کے قالب میں جدت کو دیکھ کر محافظ ناقدوں اور شاعروں نے اس کو شاعری سے بعید تصور کیا۔ تجدد پسندوں نے اس شاعری کو پسند کیا۔ ان کو ایک نیا افق اور نیا انداز تعبیر مل گیا۔ یہاں ابہام اور الہام ہے یہاں قصہ نگاری ہے، ان کے دواوین میں قصے بھی منظوم ہوئے ہیں مگر ان قصوں میں مکالمے اور عام قصوں کے عناصر نہیں کہ ان کی شاعری ایک نغمہ ہے وہ ان امور کی متحمل

---

[1] عربی میں نظم کے لیے لفظ قصیدہ استعمال ہوتا ہے۔

نہیں ہو سکتی۔ قصوں کے خطوط ان کے یہاں ملتے ہیں[1] مگر ہر جگہ ان کا اپنا قالب، وزن اور قافیہ ہے۔ انہوں نے قدامت، تقلید اور بحور کی قدیم شکلوں کو توڑ دیا ہے۔

نازک الملائکہ جو ایک عظیم شاعرہ ہیں اور شعر مرسل اور حُر کی داعی ہیں انہوں نے اس موضوع پر ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب ۱۹۶۲ء میں تصنیف کی ہے" قضایا الشعر المعاصر" وہ لکھتی ہیں کہ آزاد شاعری کو ہماری ساری شاعری پر قابض نہ ہو جانا چاہیے اسلیئے کہ آزاد شاعری کے اوزان کچھ موضوعات کے لیے تو مناسب ہیں مگر کچھ موضوعات کے لیے قطعاً نامناسب ہیں۔ اس لیے کہ آزاد شاعری میں تفاعیل کی وحدت نہیں ہے وقفے نہیں ہیں اور موسیقی کا وہ نظام نہیں ہے جس میں چشمۂ شعر ابلتا محسوس ہوتا ہے اس تبصرہ سے ہمارا مطلب آزاد شاعری سے لوگوں کو برگشتہ کرنا نہیں ہے بلکہ ہم اس امر سے لوگوں کو ڈرانا چاہتے ہیں کہ وہ صرف آزاد شاعری پر ہی اکتفا نہ کر لیں[2]، اس کے بعد وہ اپنے دیوان "شجرۃ القمر" (چاند کا درخت) میں لکھتی ہیں کہ جلد آزاد شاعری کا رجحان کم ہو جائے گا اور لوگ معروف اوزان کی طرف واپس آجائیں گے۔ اگرچہ پہلے وہ اس کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں اور اس کی توہین کر چکے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آزاد شاعری مر جائے گی۔ یہ شاعری زندہ و قائم رہے گی اور شعراء اس کو مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کریں گے، موجودہ تعصب ختم ہو جائے گا اور عربی کے خوبصورت اوزان بھی باقی رہیں گے[3]۔

ڈاکٹر طاہر احمد مکی لکھتے ہیں کہ جو لوگ آزاد شاعری کے داعی ہیں اور اس کے لیے

---

[1] پوری بحث کے لیے دیکھئے دراسات فی الشعر العربی الحدیث از شوقی ضیف طبع سابع دار المعارف مصر ص ۲۴۹ تا ۲۵۳ [2] الشعر العربی المعاصر طبع ثالث ۱۹۶۷ء دار المعارف مصر ص ۵۴ [3] ایضاً۔

جوش و خروش رکھتے ہیں اور عربی شاعری کے اوزان و قوافی پر حملہ کرتے ہیں وہ عرب ملکوں میں اقلیت میں ہیں۔ انکی مساعی یہ ہیں کہ وہ ماضی کو بھلا دیں۔ وہ نظریاتی فضا میں زندگی گذار رہے ہیں ان کا تعلق عام لوگوں سے بالکل نہیں، عوام تو قدیم شاعری ہی کا ذوق رکھتے ہیں۔ آزاد شاعری عوام سے اپنا رشتہ استوار کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غنائیت اور موسیقی کی کمی ہے اور عرب عوام نغمہ پسند ہیں، آج جب کہ یہودی عربوں پر مسلط ہیں اور ان کے خلاف جدوجہد جاری ہے ایسے موقع پر ہم کو ایسی شاعری کی ضرورت ہے جو ہمارے عوام کے جذبات کو ابھار سکے اور تسکین عطا کر سکے اور وہ مدافعت کے لائق ہو سکیں مگر جدید شاعری نغمہ کی کمی کے باعث عوام کو اپیل نہیں کرتی۔ عرب مذاق اور آزاد شاعری کے درمیان ایک خلا ہے۔ ڈاکٹر علی عشری نے اپنے مطالعہ "بناء القصیدة العربیة الحدیثة" جدید عربی قصیدہ کی بنیاد میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "جدید نظم اور قاری کے درمیان جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کی ذمہ داری دونوں پر ہے قاری تو قدیم شاعری کا ذوق رکھتا ہے مگر نئی نظم مغربی انداز تعبیر، ٹکنک اور رموز کی حامل ہے لہذا دونوں کے درمیان توافق نہیں ہے۔ قارئین یہ کوشش نہیں کرتے کہ تقلیدی شاعری کے علاوہ دوسرے انداز نظم کو سمجھیں اور ذوق پیدا کریں کہ آزاد شاعری سے لطف لے سکیں۔ آزاد شاعری عربی ماحول سے الگ رہ کر مغربی ماحول پیش کرتی ہے۔ اس طرح یہ خلا پیدا ہو گیا ہے[1]۔"

زندگی سرعت سے بدل رہی ہے ہر شئے تغیر پذیر ہے۔ زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر اکتشافات و انقلابات کا عمل جاری ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب و شاعری کا

[1] الشعر العربی المعاصر ص ۱۵۵-۱۵۶۔

ان تغیرات سے الگ رہنا ممکن نہیں۔ جس شئے کا انتظار ہے وہ یہ ہے کہ ایک عظیم عبقری سامنے آئے جو آزاد شاعری میں روح پھونک دے جیسے متنبی، بارودی اور شوقی کے یہاں ایک بلند آہنگ نغمہ ہم کو ملتا ہے پس آزاد شاعری کی کمی دراصل موسیقی ہے۔ جب تک وزن ہے نغمہ ہے موسیقی ہے شاعری بھی ہے، مشرقی ذوق اسی کا عادی ہے، ہر چند کہ مغرب میں ایسا نہیں ہے آزاد شاعری نصف راستہ میں ہے ابھی اسکو باقی نصف راہ طے کرنی ہے۔

البتہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ آزاد شاعری میں بعض شعراء نہایت اعلیٰ کلام کہتے ہیں، وہ عالم ہیں مگر آزاد شاعری کی کمی یہ ہے کہ اس کا علاقہ جمہور سے نہیں ہے اس کے پاس سامع نہیں ہیں، یہی اسکی ٹریجڈی ہے[1]۔

شعر مرسل

قافیہ کے ثقل کو عربوں نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ اہل اندلس نے موشح ایجاد کیا۔ ایک قسم "البند" کے نام سے عربی شاعری میں ظاہر ہوئی مگر قافیہ باقی رہا۔ دور جدید میں قافیہ کو ترک کر دینے کی تحریک زور پکڑ گئی، ایسی نظمیں کثرت سے موزوں کی گئیں جن میں قافیہ کو عمداً ترک کر دیا گیا۔ دراصل یہ یورپی شاعری کی آواز باز گشت ہے۔ یورپ کے شعری ذخیرہ میں ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس میں وزن تو ہے مگر قوافی ندارد ہیں۔ یہانتک کہ شکسپیر کے اکثر اشعار بلا قافیہ ہوتے ہیں صرف آخر میں قافیہ آجاتا ہے یہ بتانے کے لیے یہ خاتمہ ہے زہاوی کے یہاں ہم کو ایک ایسا قصیدہ ملتا ہے جس میں قوافی موجود نہیں ہیں غالباً شاعر نے بطور تجربہ پوری نظم میں کہیں قافیہ استعمال نہیں کیا ہے۔

[1] الشعر العربی المعاصر ص ۱۵۶، ۱۵۷۔

یموت الفتی خیر لہ من معیشۃ   یکون بھا عبئا ثقیلا علی الناس

نوجوان کا لوگوں پر معیشت میں بوجھ بننے سے بہتر ہے اس کا مرجانا۔

یعیش رخی العیش عشر من الوری   وتسعۃ اعشار الانام مناکید

مخلوق میں دس فیصدی لوگ عیش کی زندگی گزارتے ہیں اور ۹۰ فیصدی لوگ برے حال میں مبتلا ہیں۔

اما فی بنی الارض العریضۃ قادر   یخفف ویلات الحیاۃ قلیلا

کیا وسیع اہل زمین میں کوئی ایسا صاحب وسعت نہیں جو لوگوں کی سخت مصیبت کو کچھ ہلکا کرے۔

ان اشعار میں قافیہ ندارد ہے، ایک ہی نظم میں مختلف قوافی کا رواج تو عربی میں بہت پہلے شروع ہوگیا تھا مگر یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کے اندلس میں بسنے سے پہلے یورپ کی شاعری میں قافیہ نہ تھا عربوں نے جو تہذیبی وعلمی تحفے یورپ کو عطا کئے ان میں قافیہ بھی ہے۔

آزاد شاعری میں قافیہ کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ عمودی شاعری کے مقابلہ میں اس میں موسیقی کی کمی ہوجاتی ہے۔ آزاد شاعری دراصل ایک مصرع کی شاعری ہے یہ مصرع چھوٹے بڑے ہوتے ہیں کسی میں صرف ایک رکن کسی میں ۲ دو کسی میں ۳ تین اور زیادہ تک بڑھ جاتے ہیں۔ نازک الملائکہ فرماتی ہیں کہ مرسل شاعری میں وہ لطف نہیں جو آزاد شاعری میں ہے۔ عرب قافیہ پرست ہے اور مرسل شاعری میں قافیہ سے بیبر رہتاہے، وہ مثال کے طور پر پہلے جدید عراقی شاعر صلاح عبدالصبور کے یہ مرسل اشعار پیش کرتی ہیں جن میں قافیہ ندارد ہے۔

کنا علی ظھر الطریق عصابۃ من اشقیاء (ہم راستہ میں ایسی جماعت ہیں جو بدبخت ہے)

متعذبین کآلھۃ (ہم عذاب میں مبتلا ہیں خداؤں کی طرح)

بالکتب والافکار والدخان والزمن المقیت (یہ عذاب کتابوں افکار دھوئیں اور نفرت انگیز زمانہ سے ہم پر آیا ہے۔)

طال الکلام، مضی المساء لجاجۃ، طال الکلام (باتیں زیادہ ہوگئیں شام جھگڑنے میں گزر گئی اور باتیں بڑھتی رہیں)

وابتل وجہ اللیل بالانداء (رات کا چہرہ شبنم سے بھیگ گیا۔)

ومشت الی النفس الملالۃ والنعاس الی العیون (نفس کی طرف ملامت اور آنکھوں کی طرف اونگھ چلی)

مذکورہ نظم بحر کامل میں ہے۔ بحر کامل ہی میں نزار قبانی کہتے ہیں:

ولمحت طوق الیاسمین   میں نے چنبیلی کا ہار دیکھا۔

فی الارض مکتوم الانین   زمین میں جس میں آہیں پوشیدہ تھیں۔

کالجثۃ البیضاء تدفعہ جموع الراقصین   سفید جسم کی طرح جس کو ناچنے والے گروہ آگے پھینک رہے تھے۔ تمہارا گھوڑا

ویھم فارسک الجمیل یاخذہ فتمانعین   اس کو اٹھانا چاہتا تھا تو تم نے اسکو

وتقہقہین   منع کیا اور تم نے قہقہہ لگایا تھا۔

لاشئ یستدعی انحنائک ذاک طوق الیاسمین[1] (اسے جھکنے کا باعث کچھ نہ تھا وہ صرف چنبیلی کا ہار تھا۔)

تعجب ہے کہ نازک الملائکہ مرسل اشعار کی برائی کرتی ہیں اور با قافیہ آزاد قطعہ کی تعریف کرتی ہیں، محض قافیہ کے باعث جب مرسل نظم میں معنی بھی نظر آتے ہیں۔

۱ قضایا الشعر المعاصر از نازک الملائکہ، طبع خامس بیروت ص ۱۸۸ تا ۱۹۲۔

اور اس قافیہ والی آزاد شاعری میں محض قافیہ بندی ہے معنی ندارد۔

تمام نقاد قافیہ کے دلدادہ ہیں اور مرسل شاعری کی برائی کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ مرسل قصائد بھی نہایت عمدہ ہوتے ہیں، یہ شاعر کی فنی عظمت پر منحصر ہے، اعلی شاعر اعلیٰ خیالات کا اظہار مرسل شاعری میں کامیابی سے کرسکتا ہے۔

شعر منثور: لبنان میں ایک عجیب بدعت ظاہر ہوئی کہ بعض لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ نثر لکھ کر اس پر لفظ شعر کا اطلاق کیا جب قاری ایسی کتاب کھولتا ہے تو تصور کرتا ہے کہ اس میں وزن، قافیہ اور دوسری شعری خصوصیات ہوں گی، اس میں شعر کے اندر پوشیدہ اثرات کا کہیں پتہ نہیں چلتا، صرف ایک خیال کو منظم انداز سے دلکش نثر میں پیش کر دیا جاتا ہے اور کاتب تصور کرلیتا ہے کہ اس نے نثری قصیدہ لکھا ہے۔ ان ادیبوں کا تصور یہ ہے کہ شعر منثور یا فنی نثر میں جو مادہ پیش کیا جاتا ہے وہ شعری مواد کا حامل ہے۔

خزانی صبری فرماتی ہیں کہ شعر کا کوئی تعلق وزن و قافیہ سے نہیں ہے۔ وزن ایک عارضی صفت ہے، شعر کا وجود اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔ بعض اہل فکر شعر کو وزن کے ساتھ باندھنے کو حقیر تصور کرتے ہیں۔ ایسے اشعار شایع ہونے لگے ہیں جو عربی نثر میں ہوتے ہیں مگر ان کا فکر یورپی ہوتا ہے یہاں تک کہ نئی شاعری یا نثری شاعری کے دعویداروں نے یہ اعلان کر دیا کہ یہ طرز شاعری جو غیر موزوں ہے اور تقلیدی اور عمودی شاعری سے بالکل جدا ہے یہی جدید ترین شاعری ہے اور اس کا مستقبل نہایت روشن ہے۔ یہ قدیم تمام طرز و اسالیب شاعری سے جدا ہے۔ ابراہیم جبرا لکھتے ہیں کہ مستقبل میں یہی آزاد شاعری غالب ہو کر رہے گی۔ لطف یہ ہے کہ اس نثری شاعری کو

وہ آزاد شاعری تصور کرتے ہیں حالانکہ آزاد شاعری میں وزن و قافیہ سب ہوتا ہے مگر ان کا انتخاب شعراء پر منحصر ہوتا ہے، اس میں عربی اوزان موجود ہوتا ہے مگر آزادی کے ساتھ۔ صرف خلیل بن احمد کی وضع کردہ بحور سے شاعر انحراف کرتا ہے اور نازک الملائکہ کی رائے میں وہ صرف ۸ وزن پر اکتفا کرتا ہے اس لیے اس کو تفعیلات کی شاعری کہا جاتا ہے اس کا کوئی تعلق نثری شاعری سے نہیں ہے۔

نازک الملائکہ لکھتی ہیں کہ یہ لوگ شاعری کے مخالف ہیں اور شعر کو تقلیدی مذہب یا طریقہ قرار دے کر وزن کو خارج کر دینا چاہتے ہیں تاکہ نثر میں ان کو شاعر کہا جائے۔ یہ خیالی طریقہ کے پُر جوش مجاہدین نثر شعر، شاعری، شاعر جیسے کلمات کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور ان کا اطلاق نثر پر کرنا چاہتے ہیں، یعنی نثر نگار کو شاعر کہنا چاہتے ہیں۔ البتہ یہ حضرات نثر عمدہ لکھتے ہیں مگر دراصل احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اسلیے شعراء کو اپنے سے برتر تصور کرتے ہیں، چنانچہ پہلے اپنی نثری کد و کاوش کو شعر منثور قرار دیتے تھے اور اب اپنی نثر کو شعر کہنا شروع کر دیا ہے۔ ان نثر نگاروں کو سمجھنا چاہیے کہ نثر کی اپنی قیمت ہے، عمدہ نثر کے اثرات نفس انسانی پر مرتب ہوتے ہیں، دور کیوں جائیے قرآن مجید کو دیکھ لیجیے وہ نثر ہے شعر نہیں ہے مگر اس نثر میں شاعری کے تمام عناصر شامل ہیں۔ خیال ہے، تصویر کشی ہے، وصف نگاری ہے، صنائع و بدائع ہیں مگر فطری انداز سے حسب موقع۔ بلکہ یہ نثر نظم سے خوبصورت ہے، نثر کی اپنی خصوصیت ہے، پھر بھی نثر نگار احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنی نثر کو خواہ مخواہ شعر کہنا چاہتا ہے۔

بہر حال یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نثری شاعری میں وزن تو نہیں ہے مگر شاعری کے اصل عناصر معانی، خیال، جذبات اور تصویر کشی موجود ہے، خواہ ان تمام عناصر کو

موزوں شکل میں پیش کیا جائے یا غیر موزوں شکل میں، ان کا تعلق شاعری سے ہے اسلیے کہ ان حضرات کی رائے میں وزن شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے اس طرح ان کی نظر میں شعر کی تعریف یہ ہے کہ اس میں ایسے معانی جمع ہو جائیں جو عمدہ ہوں، طبیعت کو متحرک کریں اور ان میں احساسات جذبات پیدا کرنے اور تصویر کشی کی صلاحیت ہو قدیم تقلیدی شاعری میں شاعری کی تعریف کلام موزوں و مقفی سے کی گئی ہے اسمیں سارا زور وزن پر دیا گیا ہے اور مادہ کو نظر انداز کر دیا ہے، شعر میں مضمون یا مادہ یا معانی کو اہمیت حاصل ہے ان نثر نگاروں نے کوشش کی کہ شعر کی قدیم تعریف کی تصحیح کریں تو قدما سے بھی زیادہ غلطی کر بیٹھے اور وزن کو اڑا دیا، دونوں فریق غلطی کے مرتکب ہوئے ہم کو وزن کو بھی لینا ہے اور معانی و مضمون کو بھی، کچھ لوگ ناموزوں طبع ہوتے ہیں، کچھ لوگ موزونیت رکھتے ہیں مگر شعری عظمت اور تخیل سے عاری ہوتے ہیں اور بعضوں کو موزونیت شعری عظمتِ تخیل اور احساس کی دولت بھی عطا ہوتی ہے اصل شاعر یہی ہے شاعر ناظم بھی ہے مگر خیال کی عظمت ضروری ہے شعر کا اثر نفس انسانی پر نثر کے مقابلہ میں زیادہ پڑتا ہے[1]

جدید شاعری بڑی حد تک اپنے اصل راستہ سے ہٹ گئی اور اس پر نثری عناصر کا غلبہ ہو گیا۔ اس کے مضامین میں بھی سیاسی، واقعاتی اور اجتماعی مسائل و معاملات کا غلبہ اس طرح ہونے لگا کہ فنی پہلو نظر انداز ہو گئے۔ جدید شاعری میں جو بظاہر آسان معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ سے بہت سے نئے اور نو آموز شعراء دھوکہ کھا گئے اور

[1] یہ سارے خیالات نازک الملائکہ کی کتاب قضایا الشعر المعاصر کے باب قصیدۃ النثر سے مستعار ہیں، ص ۲۱۳ تا ۲۲۷۔

شوق میں کثرت سے قصائد نظم کرنے شروع کر دیے اور زبان پر قدرت بڑھانے اور فن میں مہارت پیدا کرنے کی طرف ان کی توجہ نہیں رہی۔ وہ یہ حقیقت بھی بھول گئے کہ جدید شاعری باوجود اس کے کہ اس میں فطری صلاحیت کے علمبردار شعراء نے شاعری کے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں پھر بھی وہ ابھی دور تجربہ میں ہے اور اس میں ابھی تبدیلی اور تکمیل کے بہت سے امکانات موجود ہیں، بعض حضرات اس پر بھی شک ظاہر کرتے ہیں کہ جدید شاعری میں ابھی وہ پختگی کے عناصر پیدا نہیں ہوئے ہیں جن کی بنا پر اس کو قدیم شاعری کا جانشین تصور کیا جائے اس میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے، جدید شاعری میں نثریت، خطابت، عقلیت کا غلبہ، علامت پسندی اور کبھی کبھی تجریدی انداز اس طرح واقع ہوتا ہے جو اس کو بڑی حد تک اس راہ سے دور لے جاتا ہے جس میں اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ یہ رائے ڈاکٹر علی شلش قط کی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں

کہ اگرچہ ہم اس امر سے متفق ہیں کہ جدید شاعری ابھی تجربہ کے دور سے گزر رہی ہے مگر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ جدید شعراء میں ایک طبقہ ایسا ہے جسکے یہاں اس راہ سے انحراف نہیں ملتا جس پر وہ اول اول گامزن ہوئے تھے بلکہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ نازک الملائکہ، سیاب، بیاتی، عبد الصبور، کاظم جواد، احمد حجازی، نجیب سرور اور نزار قبانی جیسے شعراء نے اپنے موقف پر جم کر اس طرح شاعری کی ہے کہ نہ فن سے انحراف ہوا ہے اور نہ مقصد و قالب سے، البتہ نو آموز شاعروں کے یہاں ہم کو تسامح نظر آتا ہے۔

اسی طرح جدید نظم پر نثریت کے غلبہ کا حال بھی ہے کہ جوش میں بہت سے نئے شاعروں کے یہاں یہ کیفیت نظر آتی ہے مگر یہ جدید شاعری کے لیے کوئی بڑا خطرناک

مرحلہ نہیں ہے اس لیے کہ ابتدائی مراحل میں اس طرز کی چیزیں پیش آتی ہیں بلکہ حشو وزوائد اور رکاکت تو کہیں کہیں قدیم نظم کے سرمایہ میں بھی نظر آتی ہے، شاعر کی ذاتی اصالت، تجربہ کی گہرائی، فنی ثقافت اور تعبیر میں اس کی صداقت وخلوص دراصل شاعری کے جوہر ہیں جن کے اس پر اثرات مرتب ہوتے ہیں، جدید شاعری میں شخصی عظمت اور فنی پختگی کا رنگ جو اس کا اصل جوہر ہے کسی حد تک شنطایا ورماد (لکڑی کے ٹکڑے اور راکھ) وقرارۃ الموجۃ (لہر کا ٹھہراؤ) از نازک الملائکہ میں اباریق مہشمۃ "ٹوٹے ہوئے لوٹے"، عبدالوہاب بیاتی کے مجموعہ میں "الناس فی بلادی (لوگ میرے ملک میں) از صلاح عبدالصبور میں اور مدینۃ بلاقلب (شہر بلا دل) از حجازی میں بڑی وضاحت سے ملتا ہے۔

استاذ علی شلش مزید لکھتے ہیں کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جدید شعراء نے ہمارے قدیم شعری سرمایہ سے غفلت برتی ہے انہوں نے اس اسلوب و اندازِ تعبیر کا مطالعہ گہرائی سے نہیں کیا جس کے اثرات ان کی شاعری پر مرتب ہوئے ہیں۔ انہوں نے وہ ٹیکنک اور وہ تجربات حاصل نہیں کیے جو تہ در تہ ہمارے چودہ سو برس کے شعری سرمایہ میں ہم کو نظر آتے ہیں۔ بلکہ زمانہ تو یہ آگیا ہے کہ ان کو عالمی ادب وشعر کے عظیم سرمایہ سے بھی بہت کچھ اخذ کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے کلام میں فنی عظمت اور ابداع کو جنم دے سکیں تاکہ ان کی منفرد شخصیت نمایاں ہو اور ان کی انفرادیت قائم ہو سکے۔[1]

---

[1] مقالہ ازمۃ الشعر الجدید از استاذ علی شلش قط، رسالہ الآداب مجلہ رابع، شمارہ ۲، مئی ۱۹۵۹ء، ص ۹۷۔

رہا یہ اعتراض کہ سیاسی اور اجتماعی مسائل براہ راست اور کھلے انداز سے جدید شاعری میں پیش کیے جاتے ہیں جس سے اس کی فنی عظمت مجروح ہو جاتی ہے اس سلسلہ میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جب پورا معاشرہ استعمار کے خلاف ذہنی وعملی جنگ میں ہو اور استعماری طاقتوں کے خلاف معرکہ بپا ہو تو اس وقت ظاہر ہے کہ ہمارے نوجوان شعراء پر جو اس معرکہ میں سب سے آگے نظر آتے ہیں یہ کیفیت چھائی رہنی لازمی ہے، استاذ علی شلش کہتے ہیں کہ ہمارے قدیم سرمایہ میں شجاعت کی شاعری حالات کے تقاضہ کی وجہ سے غالب تھی جس کو حماسہ کہا جاتا ہے ممکن ہے کہ موجودہ عبوری زمانہ عربی شاعری کو زیادہ اہم اور پُرعظمت دور شاعری عطا کرے جس میں عمدہ عناصر باقی رہ جائیں اور عارضی عناصر چھٹ جائیں۔

دراصل جدید شاعری کے بارے میں شکوک صحیح نہیں ہیں اس لیے کہ اب یہ شاعری تجربہ کی منزل سے گزر کر پختگی کی منزل کے قریب آگئی ہے۔ اس نے جدید شاعروں کا ایک عظیم طبقہ پیدا کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ قدیم شاعری جدید دور کے متقضیات کو پورا نہیں کر سکی، ڈاکٹر "قط" لکھتے ہیں:

ولیس من ضرر علی الادب	عربی ادب کے لیے یہ نقصان دہ نہیں
العربی ان یظل محتفظا بشیٔ	ہے کہ وہ کچھ رومانیت کا عنصر باقی رکھے،
من الرومانیۃ ما دامت	اگر وہ رومانیت کی سچی تعبیر پیش کرتا
تلک الرومانیۃ تعبیراً	ہو اپنے موجد کے نفس کے کسی اہم پہلو
صادقا عن جانب مھم من	کی اور ان لوگوں کے نفس کے کسی پہلو
نفوس منشئیہ ومتذوقیہ	کی بھی جو اس ادب سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

رومانیت بالکل ترک کر دینا غلطی ہے جیسا کہ اکثر "واقعیت پسند" فنکاروں نے کیا ہے بلکہ بسا اوقات واقعیت پسند ایسی چیز پیش کرتے ہیں جو رومانیت کی ترجمان ہوتی ہے۔

بہر حال جدید شاعری نے باوجود کم عمری کے قابل لحاظ ترقی کی ہے اس نے عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ ڈاکٹر بنت الشاطی نے لکھا ہے کہ:

فالقصیدة فی دیوان المدرسة	قصیدہ نے جدید مدرسۂ فکر میں ایسا
الشعریة الحدیثة قد حققت	موڑ اختیار کیا جس میں مضمون میں
التحول فی المضمون برعایة الوحدة	نفسیاتی وحدت کی رعایت اور
النفسیة والتناول الوجدانی	وجدانیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے اسی طرح
وفی الشکل بحریة التوزیع الموسیقی	ہیئت میں موسیقی کے وزن میں آزادی
وطلاقة النغم[1]	اور نغموں کے بہاؤ کا لحاظ کیا گیا ہے۔

---

[1] الادب" قاہرہ بنت الشاطی التطور فی الشعر العدد الاول السنة الرابعة اپریل ۱۹۵۹ء ص ۱۹۔

اسلام اور عربی تمدن

(مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم)

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ کرد علی کی کتاب "الاسلام والحضارة العربیة" کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس موضوع پر اردو میں کوئی جامع کتاب نہیں تھی، اس لیے دارالمصنفین نے اس کا اردو ترجمہ شایع کر کے اس کمی کو پورا کیا ہے۔

قیمت ۴۰ روپے

"مینجر"

امریکہ میں طب اسلامی پر عالمی کانفرنس

از پروفیسر عبدالرحمن مومن، بمبئی۔

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ براعظم امریکہ کی دریافت کا سہرا کولمبس کے سر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کولمبس سے چھ سو برس پہلے یعنی گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمان جہاز راں امریکہ کے ساحل تک پہنچ چکے تھے۔ یوسف بن تاشفین کے دور حکومت میں چند مہم جو جہاز راں بادبانی کشتیوں کے ذریعہ سفر کرتے ہوئے بحر اوقیانوس کے دوسرے سرے تک جا پہنچے وہاں ان کی مڈبھیڑ ان قبائل سے ہوئی جو بعد میں ریڈ انڈین کہلائے۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ کولمبس کی آمد سے بہت پہلے برازیل میں بربر قبائل آباد تھے۔ فاضل محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ برازیل دراصل بربر زبان کا لفظ ہے۔ بربروں کے ایک قبیلہ کا نام برزالہ تھا اسکی جمع برازیل ہوتی ہے جس علاقہ میں یہ قبیلہ فروکش ہوا اس کا نام برازیل پڑ گیا۔ ریڈ انڈین زبانوں میں عربی زبان کے متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں۔

امریکہ کے باشندوں کی اکثریت تارکین وطن اور مہاجرین پر مشتمل ہے۔ امریکہ میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا۔ آج امریکہ کی سبھی ریاستوں اور شہروں میں مسلمانوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ مسجدیں اور دینی مراکز ملک کے

طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ امریکی مسلمانوں کی دو انجمنیں بڑی فعال ہیں۔ ایک اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ اور دوسری اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ۔ ان انجمنوں کی علاقائی شاخیں اور دفاتر ملک کے ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔ یہ انجمنیں سماجی، تعلیمی اور فلاحی کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ ان کے سالانہ اجلاس ہوتے ہیں جن میں امریکی مسلمانوں کے مسائل پر گفت و شنید ہوتی ہے۔ ان دو انجمنوں کے علاوہ مختلف پیشوں اور علوم و فنون سے متعلق ادارے اور انجمنیں بھی ہیں۔ ان میں ایک قابل ذکر انجمن عالمی ادارہ برائے طب اسلامی (انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک میڈیسن) ہے جس کا صدر دفتر ریاست فلوریڈا میں ہے۔ امریکہ میں مسلمان ڈاکٹروں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد ہے ان ڈاکٹروں کی اکثریت برصغیر کے مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

اس ادارہ کے زیر اہتمام طب اسلامی پر ایک عالمی کانفرنس ۱۳ سے ۱۶ اپریل تک امریکہ کی ریاست فلوریڈا کے مشہور سیاحتی شہر آرلینڈو میں منعقد ہوئی۔ ادارہ کی دعوت پر میں نے مذکورہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے ۱۲ اپریل کی شب میں رخت سفر باندھا اور پیرس ہوتے ہوئے ۱۳ اپریل کی شام آرلینڈو پہنچا۔ کانفرنس کے پہلے روز کلیدی خطبہ محترم حکیم محمد سعید صاحب کا تھا۔ حکیم محمد سعید صاحب، جو حکیم عبدالحمید صاحب کے برادر خورد ہیں، بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، حکیم صاحب ہمیشہ سفید شیروانی زیب تن کیے ہوئے ہوتے ہیں ان کی چستی اور مستعدی کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ان کی عمر ۷۵ سال سے متجاوز ہو چکی ہے، وہ بلاشبہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی مختلف النوع خدمات اور بالخصوص بیت الحکمۃ کا قیام ان کی بصیرت اور عالی حوصلگی کا آئینہ دار ہے۔ حکیم صاحب نے اپنے کلیدی خطبہ میں

مسلمان اطباء اور سائنس دانوں کی جلیل القدر خدمات کو نمایاں کیا اور بتلایا کہ مغربی طب نے طب اسلامی کے بیش بہا ورثہ سے کتنا اور کیسے اکتساب فیض کیا۔ گذشتہ پانچ صدیوں میں اسلامی طب اور سائنس کے انحطاط کا پس منظر بیان کرتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا کہ نویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی کا زمانہ سائنسی اور علمی فتوحات کا زریں زمانہ ہے۔ اس دور میں مسلمانوں نے طب اور سائنس کے میدان میں حیرت انگیز پیش رفت کی اور انہیں یورپ تک پھیلایا۔ ابن سینا کی القانون فی الطب یورپ کی درسگاہوں میں درسی کتاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی۔ الرازی نے ۲۵ جلدوں میں پر مشتمل الحاوی فی الطب لکھی جس کا ترجمہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ہوا۔ الرازی نے چیچک کے بارہ میں جو تحقیق کی وہ چیچک کا ٹیکہ ایجاد کرنے کی محرک بنی۔ ابن النفیس نے ولیم ہاروے سے برسہا برس پہلے خون کے دوران کا تفصیلی ذکر کیا۔ ابن الہیثم نے بصریات پر پہلی کتاب لکھی، مسلمان سائنس داں اور اطباء براہ راست قرآن و سنت سے متاثر ہوئے انہوں نے قرآنی احکام کی روشنی میں فکر و تدبر اور مشاہدات و تجربات سے کام لیا۔ انہوں نے نہ صرف ہزاروں جڑی بوٹیوں کے خواص پر تحقیق کی اور امراض کا علاج دریافت کیا بلکہ سرجری کے طریقے بھی بتلائے اور جراحت کے اوزار وضع کیے۔

پندرہویں صدی عیسوی کے بعد سے عالم اسلام میں سائنسی اور طبی علوم کے انحطاط کا دور شروع ہوا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اپنے تہذیبی و علمی ورثہ کی ناقدری اور بے توجہی اس انحطاط کا باعث ہوئی ہماری اپنی کوتاہی اور غفلت کے سبب سے علم و حکمت کی شمع ہمارے ہاتھ سے نکل کر مغرب کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس تہذیبی و علمی انحطاط میں مغربی استعمار نے بڑا شر انگیز کردار ادا کیا ہے۔ عالم اسلام نے مغربی تہذیب کی مادی

برتری کے آگے سپر ڈال دی۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان احساس کمتری کا شکار ہوگئے۔ ان کی سائنسی اور علمی ترقی کو گھن لگ گیا اور وہ اپنے تہذیبی و علمی سرمایہ سے بے بہرہ ہوگئے۔ گزشتہ دو صدیوں میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی قابل ذکر سائنسی یا طبی دریافت اور تحقیق نہیں ہوئی ہے۔ حکیم صاحب نے یہ افسوسناک حقیقت بتلائی کہ ۱۹۹۱ء میں دنیا کے مختلف ملکوں میں طب و سائنس پر ہزاروں کانفرنسیں منعقد ہوئیں ان کانفرنسوں میں ۲۵ لاکھ مقالے پڑھے گئے۔ ان کانفرنسوں میں جو مقالے مسلمان سائنس دانوں اور اطباء کی طرف سے پیش کیے گئے ان کی کل تعداد ایک ہزار سے بھی کم تھی۔

حکیم صاحب نے اپنے خطبہ میں ذکر کیا کہ تیس لاکھ طبی مخطوطات آج بھی ترکی، روس اور ہندوپاکستان کے کتبخانوں میں موجود ہیں۔ پندرہویں صدی ہجری کے آغاز میں حکیم صاحب نے تمام اسلامی ممالک کے وزرائے تعلیم کو خط لکھا اور ان طبی مخطوطات کی اشاعت پر ان کی توجہ مبذول کرائی لیکن کسی نے ان کی اس تجویز کو لائق التفات نہ سمجھا۔ حکیم صاحب نے طب اسلامی پر عالمی کانفرنس کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان سائنسدانوں اور اطباء کے کارناموں کو نمایاں کیا جائے اور ان کی بیش بہا تحقیقات و تجربات کو سائنس و طب کے ماہرین کے سامنے پیش کیا جائے۔

کانفرنس کے پہلے روز ایک اہم مقالہ ڈاکٹر احمد القاضی نے پیش کیا۔ ڈاکٹر القاضی اپنا آدھا وقت امریکہ میں اور آدھا وقت دبئی میں گزارتے ہیں، دبئی میں امراض کہنہ پر ان کی زیر نگرانی ایک منصوبہ بر سر عمل ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس منصوبہ کی اہم تحقیقات کو شرکائے اجلاس کے سامنے پیش کیا۔ اس منصوبہ میں زیادہ تر ان جڑی بوٹیوں اور

غذاؤں پر تحقیق کی جارہی ہے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں آیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر القاضی نے شہد کی حیرت انگیز افادیت کا ذکر کیا اور بتلایا کہ انسانی جسم میں جو قدرتی نظام مدافعت (Immune system) موجود ہے اسے تقویت دینے میں شہد بڑی کارگر ثابت ہوتی ہے۔ انہوں نے کلونجی پر کی گئی تحقیقات کا بھی ذکر کیا جو صحت کی بحالی میں بڑی تاثیر رکھتی ہے۔ ڈاکٹر القاضی نے اس منصوبہ کی ایک نہایت فکر انگیز تحقیق کا بھی ذکر کیا جو ایک لحاظ سے قرآن کریم کی آیت شریفہ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کی تفسیر ہے۔ انہوں نے بتلایا کہ تلاوت قرآن اور ذکر الٰہی سے حسرت و یاس کے بادل چھٹ جاتے ہیں، اس کی تصدیق فوٹوگرافی کے جدید ترین آلات کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی طرح صالح خدمات اور خیالات کا مثبت اثر نہ صرف ہمارے اپنے دل و دماغ پر ہوتا ہے بلکہ دوسرے بھی اس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر القاضی کے بعد ڈاکٹر عبدالحق نے کلونجی پر اپنے تجربات بیان کیے۔ انہوں نے امراض نفس بالخصوص دمہ کے عارضہ میں کلونجی کی حیرت انگیز اور شفا بخش تاثیر کا ذکر کیا۔ بعد ازاں ایک امریکی ڈاکٹر مارک کوزی نے متبادل طب پر اپنے تاثرات بیان کیے اور اس موضوع پر ایک نئے علمی جریدہ کا تعارف کرایا۔ JOURNAL OF AL-TERNATIVE & COMPLEMENTARY MEDICINE کے نام سے یہ جریدہ نیویارک سے شائع ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کوزی نے کہا کہ امریکہ اور یورپ میں متبادل طب کے بارہ میں کافی دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ انہوں نے بتلایا کہ علاج معالجہ کے جدید طریقوں میں اب ان باتوں پر خاصی توجہ دی جارہی ہے کہ روزمرہ کے نظام زندگی کا امراض سے کیا تعلق ہے، صحت کی بحالی میں خود مریض کیا کردار ادا کر سکتا ہے، صحت و مرض پر مزاج اور طبیعت کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے وغیرہ۔

طب اسلامی پر اس عالمی کانفرنس میں ہندوستان سے دو اشخاص شریک ہوئے تھے۔ ایک پٹنہ میڈیکل کالج میں سرجری کے پروفیسر ڈاکٹر احمد عبدالحئی اور دوسرا راقم السطور ڈاکٹر عبدالحئی نے ابوالقاسم زہراوی پر پنا فکر انگیز مقالہ پیش کیا۔ زہراوی نے مغربی طب کو ۵۰۰ برسوں تک متاثر کیا۔ زہراوی نے نہ صرف سرجری کے مختلف طریقے بتلائے بلکہ بہت سے سرجری کے اوزار اور آلات وضع کیے۔ ڈاکٹر صاحب نے زہراوی کی کتاب التصریف کے ایک قدیم مخطوطہ کے سلائڈ پیش کیے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔

کانفرنس میں بوسنیا کے ایک سرجن ڈاکٹر حافظ کنوزرچ نے شرکت کی۔ وہ بوسنیا کے قصبہ موستار میں سرجن کی حیثیت سے مامور تھے۔ انہوں نے موستار پر سربوں کی بمباری اور قتل وغارتگری کی روح فرسا داستان بیان کی۔ بی بی سی نے ان واقعات کی جو فلم تیار کی تھی اسے شرکائے کانفرنس کے سامنے پیش کیا گیا۔ موستار میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ۶۳ ہزار نفوس پر مشتمل اس خوبصورت شہر کا سربوں نے گیارہ مہینے تک محاصرہ کیا اور گولہ بارود برساتے رہے، شہر کے پل، بازار، مسجدیں اور رہائشی عمارتیں سربوں کی بربریت اور وحشت کی نذر ہوگئیں۔ ۱۶۰۰ افراد مارے گئے اور ۶۰۰۰ لوگ زخمی ہوئے۔ ایک خیمہ میں عارضی طور سے اسپتال اور آپریشن تھیٹر بنایا گیا جہاں ڈاکٹر کنوزرچ اور ان کے رفقا زخمیوں کا آپریشن اور علاج کرتے رہے۔ گیارہ مہینے میں انہوں نے ڈھائی ہزار آپریشن کیے، بعض اوقات انہیں ایک دن میں چھ بڑے آپریشن کرنے پڑے۔ اسی دوران وہ کئی بار موت کے منھ میں جانے سے بچے۔ سربوں کی بمباری میں ان کا مکان بھی تباہ ہوگیا۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے بچھڑ گئے۔ ان کے اوزار بمباری میں

برباد ہوگئے اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور میدان چھوڑ کر نہیں بھاگے آلات اور اوزار نہ ہونے کے باوجود انھوں نے سبزی کاٹنے کی چھری سے آپریشن کیے ان کے دل میں گولہ بارود کا ایک ٹکڑا گھس گیا جسے نکالنے کے لیے انگلینڈ آنا پڑا۔ جنوبی افریقہ کے مخیر مسلمانوں نے ساڑھے چھ کروڑ روپے کی خطیر رقم جمع کی اور اس سے ایک چلتا پھرتا دواخانہ خرید کر اسے موستار کے مسلمانوں کے لیے وقف کیا۔ اس دواخانہ میں آپریشن اور مرہم پٹی وغیرہ کے تمام آلات و اوزار موجود ہیں۔

انگلستان کے ڈاکٹر محمد اسلم نے سرمہ کے بارہ میں اپنے تجربات اور تحقیقات کانفرنس کے سامنے پیش کیں انہوں نے بتلایا کہ ہند و پاک میں عام طور سے جو سرمہ استعمال کیا جاتا ہے اس میں سیسہ ملا ہوا ہوتا ہے سیسہ کا زہر جسم میں دھیرے دھیرے پھیلتا ہے۔ سرمہ کی کچھ قسمیں بے ضرر ہوتی ہیں لیکن کچھ مضر بھی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان میں سیسہ ملا ہوا ہوتا ہے اور سیسہ زہر ہے۔ اس سیسہ ملے ہوئے سرمہ سے بچوں کی آنکھوں میں جلن ہوتی ہے۔ جب وہ آنکھیں ملتے ہیں تو سیسہ ان کی انگلیوں پر لگ جاتا ہے اور پھر ان کے منھ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس سے بچہ کے دماغ کی نشو و نما متاثر ہوسکتی ہے حتی کہ موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم صاحب کے مقالہ کے بعد ایک صاحب نے حکیم محمد سعید صاحب سے پوچھا کہ آیا سبھی سرمے مضر ہوتے ہیں یا کچھ سرمے بے ضرر بھی ہوتے ہیں۔ حکیم صاحب نے جواب میں کہا کہ اصفہان کا سرمہ بے ضرر ہوتا ہے کیونکہ اس میں سیسہ کی آمیزش نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر فرید حداد نے اپنے وقیع مقالہ میں اسلامی دور کے اطباء اور سائنسدانوں کے علمی کارناموں کا جائزہ پیش کیا اور بتلایا کہ کئی طبی تحقیقات، تجربات اور مشاہدات میں

مسلمان اطبا کو اطباء مغرب کے پیش رو ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ڈاکٹر حداد نے بیان کیا کہ نوسو برسوں تک یعنی پہلی صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک سائنس اور طب کے میدان میں عربی زبان کو بین الاقوامی اور رابطہ کی زبان ہونے کا شرف حاصل رہا جس طرح آج علم طب کے حصول کے لیے لوگ اقصائے عالم سے امریکہ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اسی طرح گذشتہ زمانہ میں لوگ اس مقصد کے لیے بغداد، قاہرہ اور دمشق کا سفر کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ طب اسلامی کے بیش بہا سرمایہ سے استفادہ کرنے کے لیے بلجیم کے مشہور سائنسداں VESALIUS (متوفی ۱۵۶۴ء) اور انگلستان کے سائنسداں ولیم ہاروے (W. HARVEY) کو عربی زبان سیکھنی پڑی۔ عالم اسلام کے طبی ورثہ کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر حداد نے بیان کیا کہ بغداد کے کتبخانہ مستنصریہ میں طبی علوم پر ۸۰ ہزار کتابیں موجود تھیں۔ نویں صدی عیسوی میں قرطبہ کی لائبریری میں چھ۶ لاکھ کتابیں اور قاہرہ کی فاطمہ لائبریری میں دو۲ لاکھ کتابیں تھیں۔ طرابلس کے کتب خانہ میں جسے صلیبیوں نے جلا کر خاک کر دیا تیس۳۰ لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ ان میں سے بیشتر کتب خانے سقوط بغداد اور ہلاکو کی بربریت کی نذر ہو گئے۔

مسلمان اطبا کے علمی و طبی کارناموں کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر حداد نے بتلایا کہ دوران خون کی دریافت کا سہرا ولیم ہاروے کے سر نہیں بلکہ ابن النفیس کے سر ہے۔ مسلمان اطبا نے بے شمار امراض کی شناخت کی اور ان کے علاج تجویز کیے زہراوی کو قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا سرجن ہونے کا شرف حاصل ہے اس نے سرجری کے ۱۲۰۰ اوزاروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے ان کی تصویریں بنائیں۔ ان میں سے اکثر اوزار

خود اس کے وضع کیے ہوئے تھے۔ چند سال پہلے ہسپانیہ کے ایک مورخ نے زہراوی کے وضع کیے ہوئے اوزار از سر نو بنائے اور انہیں ایک نمائش میں پیش کیا۔ ابن سینا نے جراحت کے لیے پہلی بار سُن کر دینے والی ادویہ (ANAESTHESIA) کا استعمال کیا۔ الرازی نے بچوں کے امراض پر ایک تفصیلی کتاب لکھی۔ اس نے جانوروں پر مختلف ادویہ کے تجربات کیے۔

ڈاکٹر حداد نے بیان کیا کہ یورپ کے نشأۃ ثانیہ میں طبی کتابوں کے تراجم نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ایک طرف طبی کتابوں کے یونانی زبان سے عربی زبان میں اور دوسری طرف عربی سے لاطینی زبان میں ترجمے ہوئے۔ اس مقصد کے لیے مامون نے بغداد میں بیت الحکمۃ قائم کیا۔ اس ادارہ میں حنین بن اسحاق نے تنہا ۱۲۸ یونانی طبی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ ابن سینا کی کتاب القانون فی الطب کا لاطینی زبان میں گیارہ مرتبہ ترجمہ ہوا، الرازی کی کتاب الحاوی فی الطب کا بھی لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور نشأۃ ثانیہ کے دور میں اس کے کئی ایڈیشن شایع ہوئے۔ ممتاز مغربی اطبا جیسے VESALIUS نے اس کتاب کی شرحیں لکھیں۔ تراجم کے اس سلسلہ کے نتیجہ میں عربی زبان کے بے شمار الفاظ لاطینی، اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں دخیل ہوئے۔ ڈاکٹر حداد نے بیان کیا کہ ایک اندازہ کے مطابق انگریزی میں عربی زبان کے دخیل الفاظ کی تعداد دس۱۰ ہزار سے زائد ہے۔

کانفرنس کے دوسرے روز مشہور ایرانی فاضل پروفیسر سید حسین نصر کا کلیدی خطبہ ہوا۔ پروفیسر نصر جو عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم ہیں، جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں اسلامیات کے استاد ہیں، اسلامی تہذیب، سائنس اور دیگر علوم و فنون پر ان کی

متعدد تصانیف علمی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ انہوں نے بڑے فصیح و بلیغ انداز میں اسلامی سائنس اور طب کے احیاء پر تقریر کی۔ اپنی تقریر کے آغاز میں انہوں نے کہا کہ اسلامی سائنس اور طب مغربی سائنس کی تاریخ کے محض ایک باب کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان کی اپنی منفرد اور امتیازی حیثیت ہے۔ سائنس بلکہ ہر شعبہ علم کا بنیادی تعلق نظریۂ حیات سے ہے اور اسے سمجھے بغیر کسی سائنس یا شعبہ علم کی خاطر خواہ تشریح و تعبیر ممکن نہیں۔ بد قسمتی سے مغربی استعمار نے ہمارے ذہن و فکر پر منفی اثرات ڈالے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے علمی و تہذیبی ورثہ کی قدر و قیمت سمجھنے میں کوتاہی اور سہل انکاری سے کام لیا ہے۔ گذشتہ صدی میں طب اسلامی کو دانستہ طور پر دبانے اور اس کو تباہ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ہم نے اپنے اسلاف کے علمی و طبی کارناموں کو فراموش کر دیا۔ آج بھی دنیا کے مختلف کتب خانوں میں تیس ۳۰ لاکھ طبی مخطوطات موجود ہیں جس کی مثال دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں ملتی۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہماری اپنی کوتاہی اور غفلت کی بنا پر یورپ ہم سے بازی لے گیا۔ آج اسلامی ممالک میں سائنس اور طب کی جو حیثیت ہے وہ اس دور سے بھی ابتر ہے۔ جو یورپ میں آج سے تین ۳ سو برس پہلے تھا۔ اس کے باوجود ہمارے لیے یہ بات لائق فخر ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمان اطباء نے طب اسلامی کی شمع روشن رکھی۔

پروفیسر نصر نے کہا کہ طب اسلامی میں بڑی حرکت ہے۔ اسی بنا پر اس نے دنیا کے بڑے بڑے طبی مکاتب فکر کے عمدہ اوصاف کو اپنے اندر سمویا اور جذب کیا۔ آج سے سات سو برس پہلے ایک چینی ڈاکٹر نے اکیو پنکچر (سوئیوں کے ذریعہ علاج) پر فارسی زبان میں کتاب لکھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ طب اسلامی کے احیاء کے لیے اب حالات

سازگار ہو رہے ہیں، یورپ اور امریکہ میں قدیم نظامہائے طب کا نئے سرے سے اور مثبت انداز میں جائزہ لیا جا رہا ہے، طب اسلامی کے اصولوں مفردات اور تجربات میں اب گہری دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب مغربی دوا ساز کمپنیاں طب اسلامی کے مفردات اور ادویہ پر تجربات کر کے انہیں اپنے نام سے بازار میں فروخت کریں گی۔ لہذا ضرورت ہے کہ مسلمان سائنسداں اور اطباء خلوص اور لگن کے ساتھ طب اسلامی کے احیاء کی کوشش میں لگ جائیں۔ اس احیاء سے مغربی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی صحیح تصویر پیش کرنے میں بھی مدد ملے گی، طب اسلامی اس بنیادی نظریہ پر مبنی ہے کہ طبی اصولوں کا لازمی تعلق انسانی فطرت سے ہے۔ انسانی فطرت کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے کلی اور ہمہ جہتی انداز ہی میں سمجھا جا سکتا ہے، لہذا طبی اصولوں کی بنیاد انسانی فطرت کی وحدت کے نظریہ پر ہونی چاہیے، پروفیسر نصر نے بتایا کہ جدید طبی نظریات اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔

کانفرنس کے دوسرے روز منتظمین کی طرف سے عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے سے پہلے حکیم محمد سعید صاحب نے خطبۂ عشائیہ پیش کیا۔ حکیم صاحب کی تقریر اس موضوع پر تھی کہ آج کے نوجوان طبیب کے لیے قرآن و سنت سے کیا رہنمائی مل سکتی ہے؟ حکیم صاحب نے فرمایا کہ قرآن و سنت سائنس اور علم و حکمت کا سرچشمہ ہیں۔ قرآن کریم میں ۷۵۰ آیتیں سائنس سے متعلق ہیں۔ یہ آیتیں ہمیں کائنات کے حقائق اور نشانیوں پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں، حکیم صاحب نے یہ دلچسپ واقعہ بیان کیا کہ فرانسیسی بحریہ کے ایک افسر ژاکس کوسیتو نے اپنے بحری سفر کے دوران یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ جبل الطارق کے قریب بحیرۂ روم اور بحر اوقیانوس کے پانی مدغم ہو جاتے ہیں لیکن ان سمندروں کے

پانی جداگانہ خاصیت رکھتے ہیں۔ ان میں ایک میٹھا ہے اور دوسرا کھارا۔ فرانسیسی افسر
نے اس منظر کا بیان فرانس کے مشہور سرجن اور محقق مورس بوکائی سے کیا۔ بوکائی نے
اس سے کہا کہ اس بات کا ذکر قرآن کریم چودہ[۱۴] سو برس پہلے کر چکا ہے، چنانچہ سورۂ فرقان
میں ارشاد ہے: وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهٰذَا
مِلْحٌ أُجَاجٌ (اور وہی ہے جس نے ملے چلائے دو دریا، یہ میٹھا ہے پیاس بجھاتا اور یہ کھاری
ہے کڑوا)

خطبۂ عشائیہ کے اخیر میں حکیم صاحب نے قرآن کریم کی اس آیت وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ
فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا (جنتیوں کو صبح و شام دو وقت کھانا دیا جائے گا) کا حوالہ
دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں صرف دو وقت کھانے کی ضرورت ہے ایک صبح کا ناشتہ اور
دوسرے رات کا کھانا۔ خود حکیم محمد سعید صاحب اور ان کے برادر بزرگوار حکیم عبدالحمید
صاحب گذشتہ چالیس[۴۰] بینتالیس[۴۵] برس سے دو وقت کے کھانے پر گزر کر رہے ہیں۔
اس کے باوجود ان دونوں کی صحت نوجوانوں کے لیے بھی باعث رشک ہے۔ مزید براں
ان کے مشاغل اور کارہائے نمایاں کیفیت و کمیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہیں۔ حکیم صاحب
نے ایک حدیث نبوی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ گائے کے دودھ اور گھی میں شفا ہے
اور اس کے گوشت میں بیماری۔ حکیم صاحب نے مزید فرمایا کہ سورۂ رحمٰن میں ۲۷
نعمتوں کا ذکر ہے۔ ان میں گوشت شامل نہیں ہے۔ جنت کی نعمتوں کے ضمن میں پرندوں
کے گوشت کا ذکر آیا ہے لیکن بڑے جانوروں کے گوشت کا ذکر نہیں ہے۔

میرا مقالہ جو کانفرنس کے آخری روز پیش کیا گیا، اسلامی طبی بشریات پر تھا۔
میں نے مغرب کے نظام طب کے مزعومات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اس طبی نظام نے

انسانی وجود کو ایک وحدت سمجھنے کے بجائے اسے جسم و روح کے علیحدہ خانوں میں تقسیم کیا۔
حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود کے تمام شعبے ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط ہیں۔

صحت اور بیماری کا تعلق نہ صرف حیاتیاتی عوامل سے ہے بلکہ سماجی، تہذیبی اور
نفسیاتی امور سے بھی ہے لہٰذا امراض کے انسداد اور صحت کی بحالی کے لیے نہ صرف
دوا اور علاج و معالجہ کی ضرورت ہے بلکہ ساتھ ہی منفی نفسیاتی محرکات اور مضر عادتوں
کا ترک بھی ضروری ہے۔ جدید طبی تحقیقات اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگی ہیں۔
طب اسلامی اس بنیادی عقیدہ پر مبنی ہے کہ شفا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وَإِذَا
مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ۔ یہ نفسیاتی ایقان صحت کی بحالی میں مثبت اور موثر کردار
ادا کرتا ہے۔

اسلامی نظام حیات کی جو صفات امراض کے دفعیہ اور صحت کی بحالی میں
کلیدی اہمیت رکھتی ہیں ان میں اس کے اخلاقی نظام کی جامعیت، انسان کی اخلاقی
ذمہ داری اور جواب دہی کا تصور اور میانہ روی قابل ذکر ہیں۔ مقالہ کے اخیر میں یہ
بتلایا گیا کہ جدید طبی تجربات اور تحقیقات نے اسلامی طب کے متعدد اصولوں کی تائید
و توثیق کی ہے۔ جنسی بے راہ روی اور اباحیت جس کی قرآن و سنت میں مذمت کی گئی
ہے رحم کے سرطان کا سبب بن سکتی ہے۔ ختنہ کی وجہ سے بعض قسم کے سرطان مسلمانوں
میں عموماً نہیں پائے جاتے، شراب نوشی جگر کے امراض کا سب سے بڑا سبب ہے جو عالمی
شرح اموات کے اسباب میں سے پانچواں سبب ہے۔ خنزیر کا گوشت متعدد امراض
کا منبع ہے۔ اسلامی طب میں سادہ اور قلیل غذا پر زور دیا گیا ہے۔ اسکی توثیق و تصدیق
حالیہ طبی تجربات سے ہوئی ہے۔ عوارض قلب، ذیابیطس اور گردہ کے امراض کا براہ راست

تعلق بسیار خوری اور مرغن غذاؤں کے استعمال سے ہے۔ جدید طبی تحقیقات سے طبِ اسلامی کے اس اصول کی بھی توثیق ہوتی ہے کہ دعا، ذکر اور مراقبہ صحت کی بحالی میں مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔

بجملہ دیگر حاضرین کے حکیم محمد سعید صاحب نے میرے مقالہ کی بڑی ستایش فرمائی اور اصرار کرکے اس کی نقل حاصل کی۔ میں نے کانفرنس کے آخری روز شیروانی پہنی تھی۔ مجھے شیروانی میں ملبوس دیکھ کر حکیم صاحب کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ کہنے لگے اخاہ! آج آپ کا اور ہمارا مقابلہ ہوگیا۔ میں نے عرض کیا قبلہ! میری کیا مجال کہ آپ سے مقابلہ کروں۔ حکیم صاحب نے عاجز کے ساتھ بڑی شفقت اور خورد نوازی کا معاملہ فرمایا اور کہا کہ میں عنقریب آپ کو مدینۃ الحکمۃ آنے کی دعوت دوں گا۔

امریکہ سے واپسی کا سفر میں نے پیرس کے راستہ سے کیا۔ مقصد یہ تھا کہ پیرس میں ایک روز رک کر محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے تجدید ملاقات کر لوں۔ گذشتہ سال مجھے ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو میں نے اپنی آمد کی اطلاع روانہ ہونے سے پہلے کر دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب از راہ عنایت مجھے لینے کیلئے ہوائی اڈہ تشریف لائے۔ دن بھر ان کی صحبت میں رہا جو میری زندگی کے یادگار ایام میں سے ہے۔ شام میں وہاں کے ایک دینی مرکز میں ڈاکٹر محمد قرادغ نے ایک چھوٹی سی علمی نشست کا اہتمام کیا جس میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بھی شریک تھے۔ اس نشست میں میں نے طب اسلامی اور جدید طبی تحقیقات کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر انگریزی میں تھی، ایک صاحب نے فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ حاضرین کے سامنے پیش کیا۔

اخبارِ علمیہ

علامہ عبد اللہ یوسف علی داؤدی بوہرہ کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے، ان کی اصل شہرت قرآن مجید کے انگریزی مترجم کی حیثیت سے ہوئی، لیکن انکی ابتدائی شہرت ان کے ان مضامین اور کتابوں کی رہین منت ہے جو انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کے متعلق سپرد قلم کیں، ۱۹۰۷ء سے ۱۹۳۲ء تک اس موضوع پر ان کی پانچ کتابیں لندن اور لاہور سے شایع ہوئیں، ان کا قلم زرخیز تھا، قرآن مجید کے ترجمہ کا کام انہوں نے ۱۹۳۲ء میں شروع کیا اور ۱۹۳۴ء میں یہ لاہور سے طبع ہوا، ان سے پہلے بھی ہندوستان میں قرآن مجید کے متعدد انگریزی تراجم شایع ہو چکے تھے جیسے ۱۹۰۰ء میں مرزا ابوالفضل الٰہ آبادی، ۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر عبد الحکیم، ۱۹۱۷ء میں مولوی محمد علی لاہوری، ۱۹۱۹ء میں مرزا حیرت دہلوی اور ۱۹۳۰ء میں حافظ غلام سرور کے ترجمے، ان کے علاوہ محمد مارماڈیوک پکتھال کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۳۰ء میں شایع ہوا، عبد اللہ یوسف علی کے ترجمہ کے متعلق مختلف رائیں رہیں، مثلاً ان کا ترجمہ شاہ عبد القادر کے اردو ترجمہ پر مبنی ہے اور یہ کہ عربی میں ان کی صلاحیت اچھی نہیں تھی، جنوبی افریقہ کی مجلس العلماء نے انکے ترجمہ کے بعض اغلاط کی نشاندہی کی لیکن یہ اعتراف بھی کیا کہ ان کا ترجمہ اعلیٰ درجہ کا اور معتبر و مستند ہے، حیدر آباد میں ان کے بعض معاصرین نے کہا کہ انہوں نے دوسرے لوگوں کے ترجمے کا سرقہ کیا ہے، حال میں ان کے ترجمہ کے بعض اغلاط کی تصحیح ایک نئے

ایڈیشن میں کی گئی ہے جو مشہور فاضل ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی نظر میں اس لیے نامناسب ہے کہ اصلاح و ترمیم اصل میں کی گئی ہے جبکہ اغلاط کو حواشی کے ذریعہ ظاہر کرنا چاہیے تھا، شروع میں عبداللہ یوسف علی وکالت کے پیشہ سے وابستہ رہے، پھر وہ آئی سی ایس ہوئے لیکن ان کی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ برطانوی حکومت کے عہدیدار ہونے کے باوجود وہ اسلام کی تبلیغ کے لیے سرگرم و فکرمند رہے، انکا انتقال انگلستان میں ہوا، ان کی خواہش تھی کہ ان کی ذاتی ڈائری اور دوسرے کاغذات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اس شرط کے ساتھ سونپ دیے جائیں کہ ان کو تیس ۳۰ برس سے پہلے کھولا نہیں جائے، یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ وصیت پوری کی گئی یا نہیں، انہوں نے اپنے ترکہ کے قریباً بیس ۲۰ ہزار پاؤنڈ کار خیر کے لیے مخصوص کر دیے تھے، ان میں ایک مد لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی طلبہ کے لیے بھی مقرر تھی، یہ اور دوسرے اور اہم معلومات ان کی ایک سوانح عمری SEARCHING OF SOLACE میں درج ہیں، ایم اے شریف کی مرتب کردہ اس قابل قدر کتاب سے معاصر رسالہ امپیکٹ لندن کے مبصر کے الفاظ میں ایک مسلم دانشور کی تاریخ کے چند مخفی گوشے اور نئے باب کھلتے ہیں ۳۱۴ صفحات اور ۲۰ ڈالر کی اس کتاب کو ملیشیا کے ادارہ اسلامک بک ٹرسٹ نے شایع کیا ہے۔

جرمنی کی مشہور صاحب قلم خاتون اور علوم اسلامیہ میں درجہ اختصاص پر فائز مستشرقہ انامیری شمیل کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات محتاج تعارف نہیں، ان کی زندگی کائنات اور اس کے خالق کے حسن و جمال کے فلسفہ سے منور ہے، امن و آشتی اور قوموں، تہذیبوں اور مذاہب کے درمیان قربت و اتصال کے پہلو، افہام و تفہیم

روحانیت، ادب، تصوف، مابعدالطبیعیات، شعر، سیاحت اور اسلامی فنون جمیلہ خصوصاً خطاطی ان کے پسندیدہ موضوع ہیں، رومی و اقبال ان کے محبوب شاعر ہیں، عربی، ترکی، فارسی، اردو، پشتو، سندھی اور سرائیکی زبانوں کے ادبی سرمایہ کو جرمن اور انگریزی زبان میں منتقل کرکے انہوں نے عام فہم اسلوب میں اسلامی ثقافت کے جوہر سے یورپ کو روشناس کیا، ان کی ان خدمات کے اعتراف میں ۱۹۹۲ء میں انگریزی جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں ایک مجموعہ مضامین نذر کیا گیا تھا اب یہ ۴۴۷ صفحات میں GODISBEAUTIFUL AND HELOVES BEAUTY کے نام سے شایع کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ گذشتہ سال جب وہ ہارورڈ یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئیں تو اس موقع پر جرنل آف ٹرکش اسٹڈیز نے بھی ایک خصوصی مجلہ شایع کیا اور اب محترمہ انیس جنگ کی ایک تحریر (پانیر لکھنؤ) سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سال جرمن بک ٹریڈرس کا نہایت باوقار انعام امن PEACE PRIZE بھی انکو پیش کیا جائے گا، اس خبر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بعض جرمن دانشوروں کے ساتھ بنگلہ دیش کی نوخیز و بدنام ناول نگار خاتون نے اس اعلان پر اپنی ناراضگی کا اظہار یہ کہتے ہوئے کیا کہ "یہ ہمارے لیے اور ہم جیسے ان تمام افراد کے لیے سخت صدمہ کی خبر ہے جو بنیاد پرستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں"۔

موجودہ دور میں اسلام کی مخالفت اور دشمنی میں کفر و الحاد کے سب سے کارگر ہتھیاروں میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، مسلمانوں کی باہمی خونریزی و خلفشار بھی اسلام کے چہرہ کو داغدار بنانے کا باعث ہوئی، لیکن اس کے باوجود اس دین فطرت کی کشش اور جاذبیت اپنی جگہ قائم ہے، گذشتہ دنوں

بی بی سی کے ایک مبصر و تجزیہ نگار روجر ہارڈی کا ایک انٹرویو نظر سے گزرا، جس میں انہوں نے کہا کہ "آج اسلام دنیا میں سب سے تیزی سے بڑھنے والا مذہب ہے، سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد اب یہی مرکز نگاہ ہے، لیکن اسلام اور مسلمانوں کا منصفانہ مطالعہ اب تک نہیں کیا گیا جس کے نتیجہ میں ایک بندھا ٹکا غلط تصور قائم ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آج دنیا میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس کو سب سے زیادہ غلط طور پر سمجھا اور سمجھایا گیا ہے اور اس کے لیے صرف ذرائع ابلاغ ہی ذمہ دار نہیں، ہم نے اسلام کے متعلق جاننے کی کوشش ہی نہیں کی، اگر اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی ذرا بھی زحمت برداشت کر لی جائے تو غلط فہمیوں کے اندھیرے آسانی سے دور ہو جائیں"۔

چین میں یہ تصور بہت قدیم ہے کہ اہل علم و دانش کی مدت حیات، عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ دراز نہیں ہوتی ہے، موجودہ زمانہ میں اس خیال کی تجدید سنہ ۱۹۸۵ء کے ایک عمومی جائزہ کی روشنی میں ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ دانشوروں کی اوسط عمر ۵۲ - ۵۸ سال ہے جو عام شرح زندگی سے کم ہے، اب اس سال ۱۹۹۵ء میں زیادہ وسیع پیمانہ پر جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اب یہ اوسط اور کم ہو کر ۴۳ - ۵۳ سال تک رہ گیا ہے، یعنی ڈوہی دن بہار جانفزا دکھلانے والوں کے ساتھ اب ان غنچوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جو بن کھلے مرجھا جاتے ہیں، تجزیہ نگاروں کی رائے میں اس زوال عمر کے اسباب یہ ہیں کہ اسکالر اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے، غذا میں انتخاب ہے نہ باضابطگی، ورزش اور آرام کی پرواہ نہیں، ساتھ ہی انکے علمی و تعلیمی ادارے بھی طب و حفظان صحت کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہیں، مثلاً بیجنگ یونیورسٹی کے تین ہزار اتالیق و معلم و طلبا ایک عرصہ تک ضروری طبی سہولتوں سے محروم رہے۔

ع۔ ص۔

استفسار وجواب

حضرت بو علی شاہ قلندر کا نسب و لقب

جناب محمد مختار احمد
دلیوتی، بلیا

حضرت بو علی شاہ قلندر کا نسبی تعلق حضرت عمرؓ سے تھا یا امام اعظمؒ سے؟ ان کا اصل نام شیخ شرف الدین ہے، قلندر لقب کی وجہ کیا ہے۔

معارف: شیخ شرف الدین ملقب بہ بو علی قلندر (۶۰۵-۷۲۴ھ) کا سلسلہ نسب امام ابو حنیفہ سے ملتا ہے جو اس طرح ہے، شرف الدین بن سالار فخر الدین بن سالار حسن بن سالار عزیز بن ابوبکر غازی بن فارس بن عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم بن محمد بن دانک بن امام اعظم ابو حنیفہؒ، شیخ کے متعلق سب سے قدیم حوالہ تاریخ فیروز شاہی مکتوبہ سنہ ۸۰۰ھ میں ملتا ہے مگر گیارہویں صدی ہجری میں ان کے حالات قلمبند کیے گئے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کم سنی میں علوم ظاہری کی تحصیل مکمل کر لی تھی، دہلی میں قطب مینار کے پاس تقریباً بیس سال تک وہ درس و تدریس میں مشغول رہے، ان کے علم و فضل کا اعتراف دلی کے اکابر علماء کو بھی تھا، لیکن جب وہ تصوف کے کوچہ میں آئے تو جذب و سکر کے عالم میں علوم و فنون کی تمام کتابوں کو دریا میں ڈال کر جنگل کی راہ لی اور پانی پت کے مضافات میں آخر تک مقیم رہے، کہا جاتا ہے کہ وہ خواجہ بختیار کاکیؒ کے روحانی شاگرد تھے، ایک خیال یہ بھی ہے کہ ان کی ارادت و خلافت کا تعلق خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے ہے لیکن یہ قطعی طور پر نہیں معلوم کہ وہ تصوف کے کس سلسلہ سے متعلق تھے، البتہ انتہائے جذب و سکر میں ان کی جو

کیفیات بیان کی گئی ہیں ان سے اور عشق الٰہی کے جوش میں احکام الٰہی اور سنت نبوی کی پابندیوں سے آزادی کی قلندرانہ روایتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی بنیاد پر وہ قلندر کے لقب سے مشہور ہوئے، قلندری سلسلہ کا آغاز دمشق کے ایک قلندر کے ظہور (سنہ ۶۱۰ھ) سے ہوتا ہے، شیخ حسن نامی یہ قلندر جوالقی فرقہ کا ایرانی النسل تھا اس نے قاہرہ کے قریب قلندروں کے ایک زاویہ کی بنیاد رکھی، سنہ ۶۲۲ھ میں اسکا انتقال ہوا، گویا وہ بوعلی شاہ قلندر کا ہم عصر ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسن کے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کس سرعت کے ساتھ دمشق و ایران سے ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی اور بوعلی شاہ قلندر کی شکل میں اس کا ظہور ہوا، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بوعلی شاہ قلندر سے منسوب بعض ملفوظات سے ان کے جذب و سکر سے زیادہ ان کے صحو و ہوش کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ پانی پت کا راجہ ان ہی کے ذریعہ مشرف بہ اسلام ہوا۔ (ع۔ ص)

سلوک سلیمانی

از

مولانا پروفیسر محمد اشرف خانصاحب سلیمانی

اس کتاب میں تصوف و سلوک کی حقیقت و معرفت کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی کے نہایت دلپذیر اقوال و مباحث کو سلیقہ سے مرتب کرکے پیش کیا گیا ہے ان میں صوفی اور تصوف کے لفظ اور غیر شرعی سلوک یا عجمی تصوف اور فلسفیانہ، مبتدعانہ و عامیانہ تصوف پر سید صاحبؒ کی تحریریں نہایت قیمتی اور مطالعہ تصوف میں بہت مفید ہیں۔

قیمت جلد اول ۵۵ روپے جلد دوم ۴۰ روپے۔

"منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب اقبال رودولوی۔ رودولی

(نذرِ فیض)

وہ سوئے یار چلے ہوں کہ سوئے دار چلے
جدھر کی راہ چلے ہم تو باوقار چلے

برس پڑے ہیں وہیں آکے رحمتوں کے سحاب
جدھر سے ہو کے کسی کے گنہگار چلے

جہاں سے لیکے سکوں ساری کائنات چلی
وہیں سے ہم جو چلے کتنے بیقرار چلے

تمہارے غم کی بدولت یہ دل رہا محفوظ
اگرچہ تیر زمانے کے بیشمار چلے

بنی نہ بات تو اقبالؔ صاحبانِ خرد
ہماری وضعِ جنوں کرکے اختیار چلے

غزل

از جناب مقصود احمد مقصود۔ بڑودہ

گلہ تجھ سے ہے کوئی اور نہ شمہ بھر ہے بیزاری
مری رسوائیوں کا ہے سبب میری خطاکاری

ترے دربار میں حاضر ہوا ہوں شرم سار نہ
مرے مولا! سرِ عصیاں پہ رکھدے دست غفاری

تو میرے پاس ہے، پھر بھی میں کتنا دور ہوں تجھ سے
میانِ وصل حائل ہیں حجاباتِ گنہگاری

خمار اب بھی ہے باقی ہائے مجھ میں خواب شیریں کا
الٰہی! چشمِ غفلت کو عطا کر گُلِ بیداری

بتانِ دہر کے پرتو کو بھی عکسِ دوئی سمجھوں
مۓ وحدت کا ہو مجھ پہ نشہ کچھ اس طرح طاری

گزر جاؤں بہاروں کی طرح اک دن جو صحرا سے
کلی بن کر مہک اٹھے ہر اک خارِ دل افگاری

رکھو صحنِ رجا کو پاک یکسر گردِ حرماں سے
کہ ہو جائیں گی داں کافور ظلمات سیہ کاری

اگر مقصودؔ ان کی یاد ہی ہموار ہو جائے
نہ ہوگی راہِ ہستی میں کبھی در پیش دشواری

مطبوعات جدیدہ

یادگار نامہ فخر الدین علی احمد

مرتبین: پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، تقطیع متوسط سے قدرے بڑی، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۶۶۰، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

ہندوستان کے سابق صدر جناب فخر الدین علی احمد مرحوم کے اوصاف و محاسن میں علم پروری اور ادب نوازی خاص طور پر نمایاں ہیں، وہ صاحب ذوق تھے، غالب کے عقیدتمند تھے اور ان سے خاندانی تعلق بھی تھا، اس تعلق و عقیدت کا علمی اظہار غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی شکل میں ہوا جس کے بانیوں میں ایک اہم نام ان کا بھی ہے، اس ادارہ کو ملک کے ممتاز محققین اور اہل قلم کا تعاون حاصل ہوا اور اس نے غالبیات پر اہم کتابیں اور ایک سہ ماہی مجلہ "غالب نامہ" کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا، اب اس ادارہ نے جناب فخر الدین مرحوم سے ربط و تعلق اور ان کی عنایت و التفات کے اعتراف میں زیر نظر یادگار نامہ نہایت سلیقہ و اہتمام سے صدر مرحوم کے شایان شان شایع کیا ہے، ۲۶ بلند پایہ مقالات و مضامین کے اس مجموعہ میں جناب فخر الدین مرحوم کے حالات و سوانح پر تین تحریریں ہیں جن سے ان کی لیاقت، شرافت، تدبر اور علم و ادب سے ان کے تعلق کے مختلف پہلو روشن ہوتے ہیں، باقی مضامین مختلف النوع ہیں اور تاریخ، تصوف، ادب، تذکرہ اور

غالبیات سے متعلق ہیں، ان کے معیار و درجہ بلند کے لیے جناب مالک رام، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر سلیم اختر، جناب معین الدین عقیل، ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب شبیر احمد خاں غوری اور دوسرے نامور اہل قلم اور خود فاضل مرتب پروفیسر نذیر احمد کے اسمائے گرامی کافی ہیں، کتابت و طباعت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، البتہ پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر محمد ایوب تاباں اور پروفیسر نذیر احمد کے مضمون شیخ ابو اسحق کازرونی میں کتابت کی متعدد فروگذاشتوں کے ساتھ بعض صفحات کی ترتیب بھی غلط ہوگئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد "فکر و نظر کی چند جہتیں"

از پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت مجلد، صفحات ۱۵۵، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

یہ مولانا آزاد کے متعلق فاضل مولف کے ان چند مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً معارف اور دیگر رسالوں میں شایع ہوتے رہے، ان سے مولانا آزاد کے مسلک و فکر، ان کے طریقۂ کار، بعض مشاہیر سے ان کے تعلقات اور تقسیم ہند کے مسئلہ پر ان کا جداگانہ موقف کے متعلق بعض نہایت اہم اور غور طلب پہلو سامنے آتے ہیں، ان کی ۲ دو اہم کتابوں پر تبصرہ بھی ہے، موضوعات کے تنوع اور اختلاف کے باوجود ان مضامین میں ایک ترتیب کا احساس بھی ہوتا ہے، مثلاً ایک مضمون میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا آزاد کے تعلقات کی ایک جھلک مسلم یونیورسٹی تحریک کے نشیب و فراز کے آئینہ میں دکھائی گئی ہے، لیکن اس سے پہلے افکار آزاد اور دانشور آزاد ۲ دو مضامین

کے ذریعہ مولانا آزاد کے افکار کے دو اہم پہلوؤں کی وضاحت کر دی گئی ہے یعنی ایک تو انکے وہ خیالات جن کا تعلق پوری ہندوستانی قوم سے ہے، دوسرے وہ افکار جنکا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے ہے ان دونوں پہلوؤں کی وضاحت کے بعد ثابت کیا گیا ہے کہ مولانا آزاد حقیقی معنوں میں دانشور و حکیم تھے، ایک مضمون میں سرسید اور علی گڑھ تحریک کے حوالہ سے مولانا آزاد کے رویہ اور مسلک پر بحث کی گئی ہے لیکن اس سے پہلے ایک مضمون افکار آزاد کی معنویت اور دوسرے مضمون صحرا کی آواز میں یہ بتایا گیا ہے کہ مولانا آزاد کے نزدیک اسلام، قومیت جمہوریت اور سیکولرزم کی راہ میں حائل نہیں، سچا محب وطن ہو کر ایک مسلمان، سچا مسلمان رہ سکتا ہے نیز مولانا آزاد نے ملک کی تقسیم میں ایک ارتقا پذیر مشترک قومی تہذیب و ثقافت کی بربادی دیکھی تھی، اس سے آگاہ بھی کیا اور ناکامی کے باوجود ہندوستان کے روشن مستقبل سے ان کا یقین متزلزل نہیں ہوا، اس طرح فاضل مرتب نے اپنے دقیق و عمیق مطالعہ و تجزیہ سے فکر آزاد کو سمجھنے کے نئے گوشے اور زاویے فراہم کر دیے ہیں، غبار خاطر کا تاثراتی جائزہ نہایت دلکش ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود اہم اور بہت مفید ہے اور فاضل مولف کی رائے کو درست اور برحق ثابت کرتی ہے کہ "اس سے خاصی وسیع معلومات حاصل ہونیکے علاوہ اکثر مقامات پر ایک نیا پن محسوس ہوتا ہے"۔

مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم

از جناب پیر علی محمد شاہ راشدی، مرتب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۰، قیمت درج نہیں

پتہ: مکتبہ شاہد، علی گڑھ کالونی، کراچی پاکستان ۷۵۸۰۰۔

جناب پیر علی محمد راشدی، پاکستان کے ذہین سیاستداں، صحافی اور ادیب تھے، خصوصاً سندھی ادب پر ان کی گہری نظر تھی، قیام پاکستان سے پہلے برصغیر کی سیاست میں انہوں نے سرگرم حصہ لیا تھا، ۱۹۴۰ء کی مشہور پاکستان اسکیم کے مرتب گو مولانا غلام رسول مہر تھے لیکن اس کی تیاری اور تالیف میں راشدی مرحوم برابر کے شریک رہے، پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اپنی یادداشتوں کو اخبارات و رسائل میں شایع کیا جن کی تاریخی لحاظ سے اہمیت ہے، اس لیے فاضل مرتب نے انکو محفوظ کر لیا، اور اب زیر نظر کتاب کی شکل میں انکو یکجا کر کے شایع کر دیا ہے، راشدی مرحوم نے ان یادداشتوں میں اس خیال کا اظہار کیا کہ جو پاکستان ۱۹۴۷ء میں بنا وہ درحقیقت وہ پاکستان نہیں جس کا تصور مولانا مہر کی اسکیم میں پیش کیا گیا تھا، ایک جگہ انہوں نے لکھا کہ "بدقسمتی سے ۴۶ء و ۴۷ء غلطیوں کے سال ثابت ہوئے، ان دو سال میں ہم سے شدید غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی سزا ہم بعد کا سارا عرصہ بھگتتے رہے ہیں" برصغیر کی تاریخ خصوصاً پاکستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب مطالعہ کے لایق ہے جس سے برصغیر کی اسلامی سیاست کے کئی عبرتناک پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔

دیوار پہ لکھی ہوئی عبارت

مرتبہ جناب نسیم بن آسی، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۰، قیمت ۷۵ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

جناب آسی رام نگری مرحوم کا ادبی سفر شاعری سے شروع ہوا، بعد میں انہوں نے

نوآموز مبتدی شاعروں اور افسانہ نگاروں کی اصلاح وتہذیب کی وجہ سے مقبولیت وشہرت پائی، لیکن انکی اصل شہرت افسانہ نگاری کی مرہون منت ہے، وہ عہد اور مزاج کے لحاظ سے پریم چند کی قبیل کے افسانہ نگار تھے اس لیے ان کے افسانوں میں سماج کی عکاسی، سادہ اور پُر اثر پلاٹ اور مانوس کرداروں کی موجودگی خاص طور پر متاثر کرتی ہے، شروع میں رومانوی رنگ بھی گہرا رہا لیکن بتدریج حقیقت کا رنگ نمایاں ہوتا گیا، زبان وبیان کی خوبیوں نے ان کے فن کو مزید جلا بخشی، زیر نظر مجموعہ ان کے ایسے ہی افسانوں کا انتخاب ہے، اس سے مرتب کا حسن ذوق بھی ظاہر ہوتا ہے، ادب لطیف کے باذوق قارئین کے لیے یہ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔

غزل گلاب از جناب کالی داس گپتا رضا، مرتب جناب عبداللہ کمال، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۲، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ، جولی بھون نمبر ۱، ۱۰ نیو مرین لائنز، بمبئی ۲۰۰۰۲۰۔

جناب گپتا رضا کی متعدد کتابوں کا ذکر ان صفحات میں کیا جاچکا ہے، غالبیات کی تلاش وتحقیق میں انکا گرانقدر نثری سرمایہ محتاج تعارف نہیں، لیکن شاعر کی حیثیت سے بھی وہ معتبر ومستند اور داغ وجوش ملسیانی کی روایتوں کے پاسبان اور صاحب دیوان ہیں، ان کی غزلوں کا یہ تازہ مجموعہ ہے اور ان کی شاعری کے عہد جدید کے نمائندہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور بقول مرتب "رضا صاحب جدیدیت سے وابستہ ہوں یا نہ ہوں ان کی شاعری عصری آگہی سے مملو ہے اور انکے غزل گلاب کی خوشبو آج کی خوشبوؤں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے" چند شعر ملاحظہ ہوں:

دامانِ یار ہاتھ نہ آئے تو کیا کریں
آنسو ہے پچھلی رات ہے اور ہم ہیں دوستو

زندگی تو ہمیشہ سے جلدی میں ہے
پربتوں سے اترتی ندی کی طرح

سانس کیا کیا بھولتی ہے
آرزو سے آرزو تک

دسترس از جناب محمد عرفان، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۸، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

اس مجموعہ نظم کے شاعر نسبتاً گم نام ہیں، کم آمیزی وکوتاہ قلمی بظاہر ان کے دائرہ شہرت کی پرواز میں حائل رہی لیکن یہ مجموعہ ان کی فکر ووجدان کی بلند پروازی کی دلیل ہے، موضوعات کی جدت اور پیرایۂ بیان کی ندرت کے علاوہ انکی شاعری میں عقل وفلسفہ کی لہریں جوش وقوت کے ساتھ رواں دواں ہیں، روشنی، خوشبو، نغمہ، چراغ وداغ جیسے الفاظ کی موجودگی اور تکرار ان کے قلب وذہن میں پھیلی ہوئی چاندنی کی عکاس اور تاریکی وظلمت کے خلاف آس کی کرن ہے، عرصہ تک وہ ترقی پسند خیالات کے حامل رہے لیکن جذباتی وابستگی اور نعرہ بازی کی سطح سے اس وقت بھی بلند رہے، نظم انکا پسندیدہ ذریعہ اظہار ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ "انہوں نے نظم کو غزل کا مزاج دینے کی کامیاب کوشش کی ہے" اس مجموعہ کی ابتدا حمد ونعت ودعا سے کی گئی ہے۔

نشاط خاطر از جناب حسنین عظیم آبادی، چھوٹی تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۵، قیمت ۱۶ روپے، پتہ: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴ ۸۰۰۰۰۔

اردو کے انشائیہ نگاروں کی مختصر فہرست میں ڈاکٹر حسنین عظیم آبادی کا نام

معروف ہیں، وہ انشائیہ نگار ہی نہیں انشائیہ شناس بھی ہیں، عرصہ ہوا انھوں نے ایک کتاب صنف انشائیہ اور انشائیے کے نام سے لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی، زیر نظر کتاب ان کے ۱۲ انشائیوں کا مجموعہ ہے اور یہ اس کا چوتھا ایڈیشن ہے اس سے اس کی مقبولیت ظاہر ہے، ان کا خیال ہے کہ انشائیہ تلاش ذات یا دید معاشرہ میں جس قدر موثر و مفید ہے اردو کی کسی دوسری نثری صنف کو یہ تنومندی حاصل نہیں، انکا یہ خیال گو محل غور و نظر ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے انشائیوں کا شگفتہ اسلوب، لطیف طنز، پابند حدود ظرافت اور باتوں باتوں میں کچھ سوچنے اور سمجھنے کے مختصر لمحات عطا کرنے کی صلاحیت، بے ساختہ داد دینے پر مجبور کرتی ہے۔

تاریخ اسلام از جناب سلام اللہ صدیقی، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت صفحات ۲۵۶، قیمت درج نہیں پتہ: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی، یوپی۔

اس کتاب میں عہد نبوی سے بنی امیہ تک اسلام کی تاریخ کو مختصر اور سلیس انداز میں پیش کیا گیا ہے، اندلس کی تاریخ پر بھی ایک باب موجود ہے، لائق مولف نے خلافت راشدہ اور بنی امیہ کے دور آغاز کے نازک واقعات کو طلبہ کے ذہن و مزاج کے مطابق خاص طور پر احتیاط و سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض تاریخی واقعات کی روایت و درایت میں تاریخ کی غلط ترجمانی اور مسخ واقعات پر انھوں نے خاص توجہ کی ہے، البتہ انگریزی الفاظ و تعبیرات ضرورت سے زیادہ ہیں، جیسے صفہ یونیورسٹی، ٹرینڈ خواتین وغیرہ، کتاب کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ پاکستان میں اسکے تین ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں، ہندوستان میں یہ پہلی بار طبع ہوئی ہے یہ طلبہ کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی مفید ہے۔

ع۔ص۔

دار المصنفین کی اہم ادبی کتابیں

شعر العجم حصہ اول: (علامہ شبلی نعمانی) فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد ترقی اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور عباس مروزی سے نظامی تک کے تمام شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۔۳۰ روپے

شعر العجم حصہ دوم: شعرائے متوسطین خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت ۔۳۵ روپے

شعر العجم حصہ سوم: شعرائے متاخرین فغانی سے ابو طالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت ۔۲۵ روپے

شعر العجم حصہ چہارم: ایران کی آب و ہوا، تمدن اور دیگر اسباب کے شاعری پر اثرات و تغیرات دکھانے کے علاوہ تمام انواع شاعری میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔ قیمت ۔۳۵ روپے

شعر العجم حصہ پنجم: قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت ۔۳۰ روپے

انتخابات شبلی: شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح، عیب و ہنر، شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۔۲۵ روپے

کلیات شبلی (اردو): مولانا شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی قصائد اور تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔ قیمت ۔۲۵ روپے

گل رعنا: (مولانا عبدالحئی مرحوم) اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد اردو شعرا (ولی سے حالی و اکبر تک) کا حال اور آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ۔ قیمت ۔۷۰ روپے

نقوش سلیمانی: مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمات، خطبات اور ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں اردو کے مولد کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت ۔۶۰ روپے

شعر الہند حصہ اول: (مولانا عبدالسلام ندوی) قدما کے دور سے جدید دور تک اردو شاعری کے تاریخی تغیر و انقلاب کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ۔

شعر الہند حصہ دوم: (مولانا عبدالسلام ندوی) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید۔ قیمت ۔۵۰ روپے

اقبال کامل: (مولانا عبدالسلام ندوی) ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح حیات، فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ان کی اردو فارسی شاعری کی ادبی خوبیاں اور ان کے اہم موضوعات فلسفہ خودی و بیخودی نظریہ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق کی تشریح۔ قیمت ۔۳۰ روپے

اردو غزل: (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اردو غزل کی خصوصیات و محاسن اور ابتداء سے موجودہ دور تک کے معروف غزل گو شعرا کی غزلوں کا انتخاب۔ قیمت ۔۵۰ روپے